اِک تماشہ
افسانے
وقار مصطفیٰ سپرا

اِک تماشا

وقار مصطفیٰ سپرا

روایت اور دردِ دل کے نام

ہمارے عہد میں اس کے مظہر LUMS، اخوت اور ہر سُکھ

ان اداروں کے بانی حضرات کے نام

جناب چوہدری محمد آصف صاحب (T.P) کے نام جنہوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔

جناب زاہد حسین (رائٹرتسی دھرتی) اور جناب سعید بھٹہ صاحب (GCU) کے نام وہ اولین اشخاص جنہوں نے ماں بولی کی طرف میرے شوق کو بڑھایا۔

تفصیل کہانیاں

۱۔ بمہ حقہ (اُردو)

۲۔ قصہ گزشتہ (اُردو)

۳۔ دُکھ کی جاگیر (اُردو)

۴۔ اِک تماشا (اُردو)

۵۔ قصہ حسرت (اُردو)

۶۔ سودا (اُردو)

اے عشق ازل گیر و ابد تاب
اے کاہن دانشور و عالی گہرو پیر
تو نے ہی بتائی ہمیں ہر خواب کی تعبیر
تو نے ہی سمجھائی دل گیر کی تسخیر
ٹوٹی ترے ہاتھوں ہی سے ہر خوف کی زنجیر
اے عشق ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

(ن م راشد)

پیش لفظ

''اک تماشا'' پیش خدمت ہے۔ یہ کہانی ہے خوابوں اور خیالوں اور خواہشوں اور کہانیوں کے تماشا کی۔ یہ جھلک ہے ایسے بڑے تماشے کی جو کہ ہمارے اردگرد مسلسل جاری ہے۔ یہ کہانی ہے خیالات مسلسل کی۔ جو کہ شائد غائب سے آتے ہیں؟ اور پھر اچانک چلے بھی جاتے ہیں لیکن چند خیالات رک جاتے ہیں اور وہ پھر آپ کی زندگی کو اثر انداز کرتے ہیں۔ وہ جو چند خیالات جو عملاً اک تماشا بناتے ہیں۔ یہ اس کی کہانی ہے۔ اس خوش قسمت گروہ کی۔ جن کی زندگی کا کوئی بھی مضمون لازمی نہیں۔ جن کے ساتھ زندگی مہربانی سے پیش آئی۔ جن کے خواب حقیقت بن گئے نا کہ دھیرے دھیرے ڈسنے والی۔۔۔۔۔ وہ جن کو زندگی کھیل تماشا کی طرح ملی اور انہوں نے اس کو ایک تماشا ہی سمجھا اور اس کا لطف لیا۔ اس تماشا میں کئی پہلوؤں اور کئی رنگ ہیں۔ کچھ کو رنگ دیا کچھ رہ گئے۔ خیالوں کو اپنے حساب سے آنے اور جانے کا عمل کرانے والوں خوش قسمت انسانوں میں ایک کی کہانی ہے یہ۔ ورنہ یہ خیالات ہی انسان کو تباہ کرتے ہیں اور یہ خیالات و افکار ہی اس کو کامیاب بھی۔ کہانی نگار کے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تاریخ اور روشن ہر دو پہلو دیکھنا چاہیے۔ کوشش کی ہے کہ اس میں کچھ روشن و مثبت پہلو کو اجاگر کرو۔ لیکن کرو کیا اردگرد پھیلی رنج والم کی فضا کا اثر نہ چاہتے ہوئے بھی گفتگو دو تحریر پر آ ہی جاتا ہے۔ لیکن کوشش کی ہے کہ ایک قدیم اور خوشگوار اور آسودہ اور جدید بھی ایک اسی زندگی کا عکس

آپ کو اس میں دیکھنے کو ملے۔ باقی کامل دکھ میں مبتلا انسان جتنا بھی تماشا کرلیں۔ وہ ہوتا ''اک تماشا'' ہی ہے کوشش اور جستجو کا نام ہی زندگی ہے۔ اور انسان وہ ہی ہے۔ جس کی وہ کوشش کرے اور دعوہ۔ بہر حال بے ربطہ خیالوں خوابوں کی کہانی آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ کو لگے کہ یہ اسی تماشا کی ایک جھلک ہے۔ جو کہ آپ کی زندگی کا بنا چکا ہے یا جو کہ آپ روز اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ جو پھر میری یہ کاوش قدرے کامیاب ٹھہری۔ کیونکہ ''زندگی میں کچھ بھی کامل ٹھیک یا کامل غلط نہیں ہے۔ تو اس لئے میں نے کہا کہ قدرے کامیاب بہر حال حسب روایت و سابقہ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ تنقید سے خوشی ہوتی ہے اگر وہ مدلل (دلائل کے ساتھ) ہو۔ ہاں اختلافات بارے اختلاف کرنا ہو (ا) تو وہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ کیونکہ تماشا تو میں نے لکھ لیا ہے اب مزید کیا کرنا ہے۔ مدلل تنقید اور بلا وجہ تعریف کرنے والوں کو خوش آمدید کہوں گا۔ اور ان کا انتظار بھی رہے گا۔ والسلام

وقار مصطفیٰ سپرا

waqirmustafa86@gmail.com

بمعہ حقہ

وہی کھیت وہی کچے مکانات وہی کھلے بازار، وہی گرد اور وہی گرما
جی ہاں یہ ہے چک 50 جنوبی جو کہ واقع ہے ضلع پاکپتن شریف بھی۔
یہ چک بھی چک بندی کے وقت کے آباد ہوا۔ دریائے نیلی کے کنارے اس چک میں بھی سرسبز کھیت کے کنارے قطار در قطار درجنوں درخت تھے۔عرض ایک روایتی چک اس چک میں بھی جٹ اور انگڑ آباد تھے۔ اور ان کی وہی روایتی کت کت تھی جو کہ وسطی پنجاب کے ہر چک میں ہوتی ہے۔
آج 50 جنوبی کا بوڑھا منور جٹ المعروف مانی جٹ اپنے ڈیرہ میں حسب روایت اپنے بوڑھے سوکھے جسم پر تیل کی مالش کروا کر دھوپ میں لیٹا پڑا تھا۔ مانی جٹ 0 5 شمالی میں مبلغ 3 ایکڑ 6 کنال 9 مرلہ زمین کا اکلوتا مالک تھا۔عمر اس کی اب راتیں ڈال کر 70 سال اور 17 دن ہو چکی تھی۔ رمضی مصلی جو کہ صبح کا چوہدری آف خوامخواہ کی رعب دار نظریاں اور زوال پذیر جسم کو برداشت کر کے تنگ آ چکا تھا اب اس چکر میں تھا کہ کیسے مانی جٹ سے جان چھڑوائے اور جا کر اپنے مویشی کو چارہ ڈالے۔ لیکن رمضی مصلی کو مانی جٹ کی مدد بھی اپنے ایک کام کے لئے مطلوب تھی۔
اس دوران ڈیرہ میں رفیق جٹ آیا۔ اس کو کانی آنکھ سے دیکھ کر مانی جٹ ویسے ہی لیٹا رہا۔ دھوپ میں مالش کروا کر مانی کا جسم دھوپ میں چمک رہا تھا لیکن صاف پتہ بھی دیتا تھا کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ یہ خم وخاک ہو جائے گا۔

رفیق جٹ نے کہا ''اوئے مانی! کوئی امیر بخش حوالدار آیا سی۔ تیرا پوچھا تھا میں نے ٹال دیا۔ تیرا کسی پرانے دولے میں نہ آیا ہو۔

مانی جٹ امیر بخش کا نام سن کر اٹھ بیٹھا۔ رمضی فضلی نے بھی شکر پڑھا کہ چلو اب اٹھ گیا ہے تو مالش سے جان چھوڑی۔ اب یہ رفیق جان چھوڑے تو اپنا مسئلہ بناؤ۔ مانی جٹ کی جغرافیائی چوہدراہٹ بے شک 3 ایکڑ 6 کنال 9 مرلہ کی تھی لیکن اس کی ''دبکا'' اور گھونگھر پورے 50 شاملی میں چلتی تھی۔ اسی لیے تو مصلی صبح اس کے پاس آیا اور اس نے یہ پوچھے بغیر کہ وہ کیوں آیا ہے؟ اس کو تیل کی بوتل دی اور کہا کہ ''چل اوئے! ذرا زور نال مالش کر۔'' اب مصلی جو کہ اپنا دکھڑا لے کر آیا تھا۔

اس کو وہ بھول گیا اور وہ شروع ہو گیا۔ اب مانی کا خشک اور سوکھا بدن نہ جانے کب سے تیل کے لمس سے نا آشنا تھا۔ تقریباً پوری بوتل ہی اس کا جسم پی گیا۔

مانی جٹ جو کہ اب رفیق کے آنے کی وجہ سے اٹھا بیٹھا تھا کہ چہرہ پر کچھ پریشانی بھی آ چکی تھی اور اس پریشانی کو وہ موجود دونوں دیگر افراد نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ رفیق جٹ بھی سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ جب ہی تو امیر بخش حوالدار کا نام سن کر مانی جٹ بدلا بدلا نظر آنے لگا تھا۔

رفیق نے پوچھا مانی اب خیر تو ہے'' مانی جٹ نے جواباً کہا یار پتہ نہیں۔ تجھے یاد ہے کہ اپنی انگڑوں کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی 5 سال پہلے۔ ہاں جس میں اپنے اشرف کا انہوں نے سر پھاٹ دیا تھا وہی نہ مانی بولا: اڈیوں! دہی۔ رفیق بولا: اس زمانے میں تو آٹھ پہر حقہ پیتا تھا نہ'' ساتھ اس نے ماحول میں رچی ٹینشن کم کرنے کے لئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ہاں یار! اب تو جب کا یہ مویا کینسر ہوا حقہ بھی بند ہو گیا۔ اس سے تو بہتر تھا میں حقہ پیتا پیتا مر جاتا۔ حقہ بھی اپنی جان تھی رفیق نے دیکھا کہ مانی جٹ کی آنکھوں میں نمی تیر آئی۔ رفیق کو حیرت کا جھٹکا لگا مانی جٹ وہ بندہ تھا جو اپنی ماں مر پر ایک پل نہ رویا اور آج حقہ کو یاد کر کے اس کی آنکھ میں نمی تیر آئی۔

لیکن رفیق کی اور اب تو رفضی مصلی کو بھی اس سب میں جو کہ امیر بخش حوالدار سے شروع ہو کر حقہ

سے ہوتا ہوا آنکھ کی نمی تک آ گئی بات آ گئی تھی میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن مانی جٹ تو پرنم آنکھوں سے آسمان میں نہ جانے کیا کھوج رہا تھا۔

پھر خود ہی گویا ہوا۔

رنگڑوں کی لڑائی کے بعد ہم دونوں پارٹیوں پر پولیس نے 7/51 کر دی تھی۔ لیکن پولیس نے دونوں گھروں کی گرفتاری نہ کی تھی۔ رفضی مصلی جو کہ صبح کا چپ بیٹھا تھا۔ درمیان میں بولا:

کیوں؟؟

مانی جٹ نے اس کو پر قہر نظروں سے اس کو دیکھا تو رفضی مصلی اندر تک کناچ گیا۔ اور نظریاں چرانے لگا۔ اس ساری صورتحال کو دیکھ کر رفیق نے درمیان میں مداخلت کی اور بولا: اچھا! ''مانی فیر کی ہویا'' مانی پر بھی رفیق کے اس جملے نے کوئی جادو بھرا اثر کیا۔

مانی بولا: اچھا ہاں، میں چونکہ نامزد ملز مان میں سرفہرست تھا اس لیے ہر پیشی پر بمعہ حقہ جاتا تھا۔ اب رمضی مصلی نے سوچا موقع ہے چوہدری کی خوشنودی حاصل کرنا کا۔ اس نے پھر درمیان میں بولا۔ چوہدری صاحب آپ کے بغیر ان جٹوں کی سناتا بھی کون۔ اس جملہ پر وہاں موجود ہر دو جٹوں کو غصہ آیا۔ چوہدری مانی نے اس کی طرف دیکھ کر دھاڑ کر کہا۔

''اوئے چوڑیا! اب تو بھونکا تو تیری زبان کھینچ لونگا۔''

رفیق کا غصہ اس واقعہ کے فوراً بعد مفاہمت میں بدل گیا۔

اس نے فوراً مانی کو کہا: ''اوئے چھوڑ چوہدری تو وی کمی دی گل منن لگ گیا''۔

مانی جٹ نے ایک لمبا سانس کھینچا اور پھر بات کو جوڑا اور بولا ہاں شاید تیسری یا چوتھی پیشی تھی کہ مجھے جج نے ضمناً کہا کہ چوہدری صاحب یہ حقہ گھر یا ڈیرہ رکھ کر آیا کریں۔ کورٹ کا کوئی ادب آداب ہوتے ہیں۔ آپ یہاں بھی حقہ لے آتے ہیں اور آلودگی پھیلاتے ہیں کورٹ کے Decoream اور صفائی اور ماحول کا سہ طرفہ نقصان کرتے ہیں۔ اس طرح نہ کریں۔

میں نے جج کو کہا: جج صاحب سہ طرفہ بولے یا چار طرفہ حقہ کے بغیر تو میرا ایک منٹ نہیں پڑتا۔ اس لئے آپ ایسے مقدمہ چلاؤ۔ حقہ نوں جھاڑو۔ خیر جج کا چہرہ رفیق، مجھے آج تک یاد ہے۔ اس پر ایک بے بسی ایک مروت اور ان دونوں کے نیچے دبا ہوا غصہ مجھے وہ تاثرات بلکہ تاثر چہرہ آج تک یاد ہے۔ خیر ہم اپنے فقیرایا ہے نہ اس کو وکیل کیا۔ رانگڑو نے املاک گجر ہے نہ جو بعد میں اپنے شجاعت حسین کی پارٹی کے ٹکٹ پر MNA بھی بنا۔ اس کو وکیل کیا ہوا تھا۔

خیر کوئی 8 ویں یا نویں پیشی پر وکیلوں کے صلاح سے جج نے دونوں پر چے خارج کر دیے۔ اس دن جج نے میں بھی موقع پر موجود تھا۔ اس دن جج نے دونوں فریقوں کو ہمراہ تمام نامزدگان کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ رانگڑوں کا بابا تھا طفیل۔ وہ تو ڈر کر آیا ہی نہیں کہ ان ججوں کا کوئی پتہ تو لگتا نہیں۔ ان کا کوئی پتہ تو لگنا نہیں۔ کیا پتہ سارے ٹھٹھے کو ہی بن دیئے۔

خیر لیکن میں وہی صرف ویسے جٹ کا پتر منور عرف مانی میں تو تجھے پتہ ہے جوانی میں ڈرتا ورتا کسی سے نہ تھا۔

رفیق نے شہر اور حوصلہ کے لئے کہا: او مانی! یار تو اب کون سا ان رنگڑوں کے ڈنگر نہلاتا ہے۔ اب بھی تو مانی جٹ ہی ہے۔

مانی جٹ نے کہا: ہاں یار تیری بات تو ٹھیک ہے لیکن چوہدری اب یار جسم پٹیک نہیں نکالتا۔

خیر بات ہو رہی تھی اس آخری پیشی کی۔

جج نے ہمیں صبح 9 بجے بلایا۔ لیکن کیس دوسرے لگا تار ہا خیر کوئی دوپہر 3 بجے تک ہم بھوکے پیاسے وہاں عدالت کے باہر پاکپتن کچہری میں کھڑے رہے۔ 3 بجے جج نے تمام نامزدگان کو طلبا اور سب پر ایک بھرپور نظر ڈالی جیسے گن رہا ہوں کہ کوئی کوئی کم تو نہیں پھر اس نے ایک جملہ کا حکم بولا: دونوں پر چے خارج۔ تمام نامزدگان بری و لیکن منور عرف مانی جٹ بمعہ حقہ 6 ماہ کے لیے اندر یعنی قید۔ اب بندہ پوچھے۔ بمعہ حقہ حکم سنو۔

خیر میں نے جج کو کہا:

صاحب بہادر اس مہربانی کی وجہ؟؟ اور یہ بمعہ حقہ کیا ہوا۔

جج نے کہا چوہدری صاحب آپ کو میں نے روکا تھا کہ اس کو اپنے ڈیرہ پر رکھ کر آیا کرو لیکن آپ کو بات سمجھ نہ آئی اب آپ 6 ماہ اس کے ساتھ اندر رہو تا کہ آپ کے شوق کی تسلی ہو،

خیر میں نے جج کو کہا کہ میری جاتی ہے جوتی جیل میں۔

اور یہ کہہ کر تو نے تو سنا ہی ہوگا۔ میں کچہری سے بھاگ پڑا۔ یہ حرام کا جنا امیر و حوالدار میرے پیچھے پیچھے خیر کوئی تین میل بعد اس نے مجھے یادگار چوک جو کہ بابا صاحب سے اگلے طرف ہے۔ وہاں پر میں تھک کر گر پڑا یہ جوان تھا۔ اس نے مجھے آلیا اور مجھے پکڑ لیا۔ اور تھانہ ڈل وریام میں لے کر حوالات میں بند کر دیا۔ خیر بورا والا دلاور تھانیدار تھا میں نے اس کی منت کی کہ یار مجھے چھوڑ دے جہاں دونوں طرف کے 60 آدمی بری ہوئے میری بھی جان چھوڑو

لیکن اس نے کہا چوہدری میرے ساتھ ایسے بات کر جیسے پولیس والوں سے کرتے ہیں۔

میں نے کہا "سردارا! بتا پھر کیا کرو پتر اس نے کہا مانی جٹ! ایک تو 6 ماہ کی قید دوسرا جج نے تیرے پر توہین عدالت کی بھی 1 سال قید بول دی ہے۔ اب بھرا سادی سی بات ہے۔ روپیہ تیرے سے لونگا پورا دس ہزار اور تو فارغ۔

خیر رفیق تجھے یار ہوگا بھائی عالم خان میرے پیچھے آیا تھا۔ یعنی بڑا بندہ تھا۔ اولاد تو اس کی حرام کی نکلی نہ معلوم کس پر گئی۔ باپ والی کوئی بات ہی نہیں ان میں رفیق جو کہ اب اس کہانی سے اُکتا گیا تھا۔ اس نے یاد کروایا تا کہ یہ کہانی ختم ہو اور وہ جا کر اپنے مال کو پارہ ڈالے۔

اس نے کہا: اچھا پھر کیا ہوا تھانہ میں

مانی بولا: ہاں بھائی عالم خان بچارے اس اپنے دو ڈنگر بیچ کر پورے 6 ہزار تھانیدار کو لے دیئے۔

لیکن دلاور نے کہا کہ نہ بھائی پورے 10 ہزار۔ خیر بھائی عالم نے بچارے نے مہلت مانگی۔ اس

دوران ایس پی نے تھانے کا دورہ کرنا تھا۔ اس حوالدار مہر بخش کو اس نے ہتھکڑی لگا کر مجھے دیا۔ یہ مجھے لے کر چل پڑا۔

ہم وہ سے قبولہ شریف بازار میں آئے۔ میں نے اس کو کہا میرے پاس 50 روپیہ ہے۔

3 دن ہو گئے کوئی سرک روٹی نہیں کھائی ۔آ جا کڑاہی گوشت کھاتے ہیں۔ اس نے بھی جب دوکان کے پاس سے گزرتے ہوئے دیسی گھی کی بھونی لگی دیکھی تو اس کا دل آ گیا۔

اس نے کہا: ٹھیک ہے چوہدری لیکن اب کے کوئی حرام زدگی نہ کری۔

میں نے دل میں اس کی ماں بہن ایک کی لیکن کہا نہیں آرام سے روٹی کھا کر واپس چلتے ہیں۔آج ویسے بھی عالم خان نے رقم لے کر آنی ہے میں نے چھوٹ ہی جانا ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے بھاگنے کی۔

اس نے کہا ہاں چلو پھر دو دیسی پٹھے کی بنوا کڑاہی۔ خیر ہم بیٹھے دو بوئے پٹھے کی کڑاہی وہ کیا کہتے ہیں دیسی دیسی میں پکا۔

جب کھانا سامنے آیا تو میں نے کہا امیر بخش یار ہتھکڑی تو کھول دے اس نے بھی کھانے کے اشتیاق میں کھول دی اور ساتھ ہی میرے لئے دال کا کہا

میں نے کہا امیر بخش دال کون کھائے گا۔ اس وقت تک اس کے سامنے کڑاہی گوشت یعنی دیسی دیسی میں آ چکا تھا۔ اس نے کہا تو کھائے گا اور کون۔ میں نے غصہ میں آ کر ہاتھ مارا اور کڑاہی زمین پر گرا دی

اس نے فوراً سے پہلے زمین سے کڑاہی اٹھی اور میں بھاگ پڑا۔

اس نے مجھے گالیں نکالی لیکن باقی کڑاہی کے ساتھ روٹی کھانے لگا۔ آفرین ہے وہ میرے پیچھے نہیں آیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

قصہ گزشتہ

وہی روزمرہ کی شام تھی، سجان سنگھ اردو پارک میں آوارہ پھر کر واپس اپنے گھر جانے سے پہلے بیس روپیہ میں آج حاجی شبراتی کی دوکان سے نہاری کھانے کا ارادہ سے اردو پارک سے مٹیا محل والی گلی سے گزر رہا تھا کہ تنگ قدیمی گلی میں سرشام ہی اندھیرہ اندھیرہ سا تھا اور کھلی نالی کی بدبو پھیلی تھی۔ اور ساتھ ہی بعض جگہوں پر گندبھی۔ وہ اپنی نیکر اور ابا کے وقت کے جوگر پہنے ہوا تھا۔ اس لئے اس کو تیز چلنے اور ان گندگی کے جزیروں سے بچنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ بازار میں اس نے بابو بھائی کی دوکان سے پانچ روپے میں دو کباب اور حاجی شبراتی کی دوکان سے دس روپیہ میں نہاری لی اور وہاں تھڑے پر بیٹھ کر کھانے لگا اور سوچنے لگا کہ کانگریس کی مرہٹہ راؤ حکومت میں مہنگائی بہت ہوگئی ہے۔ ہر چیز کو آگ لگ گئی ہے۔

رات ہی اس کا دادا دلمیر سنگھ سرکاری نے کہہ رہا تھا کہ راؤ سرکار نے بنیا سکھ کو خزانہ کا وزیر بنایا ہے جو امریکہ سے پوچھ پوچھ کر مالی پالیسی بناتا ہے۔ اسی دوران سجان سنگھ نے دیکھا کہ اس کا دوست سلمان اپنی گلی سے نکلا ہے۔ اس نے آواز دے کر بلایا اور اس کے ساتھ نہاری کھانے لگا۔ سلمان نے بتایا کہ اس کے باپ کو اس ماہ تنخواہ نہیں ملی کیونکہ جس کمپنی میں اس کا باپ نوکر تھا، اس کا کاروبار CBI نے بند کروادیا ہے اور سیٹھ کو پکڑ کر نئی دہلی تفتیشی سنٹر لے گئے ہیں۔ اس لئے اب وہ بہت پریشان تھا لیکن اس وقت وہ نہاری سے محظوظ ہونے لگا۔ اس نے بہت دنوں سے باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ سجان سنگھ کو اس کا بھوکوں کی طرح نہاری پر حملہ بہت بُرا لگا۔ اب اس نے بلایا

بھی خود تھا اس لئے روک بھی نہیں سکتا تھا لیکن دل میں کہا ''انسان کو خود ہی کچھ شرم کرنی چاہیے۔
سلمان نے کھانے سے فارغ ہو کر کہا، یاراں سرداراں دی جے اور قہقہہ لگایا اور یونیورسٹی کا حال پوچھا

سجان سنگھ دہلی کی جواہر لال یونیورسٹی میں کلچر اسٹڈیز کا طالب علم تھا۔ وہ بالکل بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کلچر کیا ہے اس لئے اس نے سوچا کہ وہ کلچر کو تفصیل سے پڑھے اور سمجھے لیکن اس کی قسمت کہ شعبہ کا ڈین ایک مدراسی پنڈت تھا اور اس کو صرف دنیا کے ایک ہی کلچر کا پتہ تھا اور وہی اب وہی طلبہ کو ازبر کروانے پر تلا تھا۔ پنڈت رام نارائن کا باپ سندھ میں تقسیم کے وقت سیکریٹیٹ میں ملازم تھا اور اس کی حیدرآباد کی ہندو کمیونٹی میں کافی عزت اور اثر تھا لیکن ان کو وہاں سے نقل مکانی کرنی پڑی اور وہ اور ان کا خاندان دہلی آیا اور دہلی یونیورسٹی میں ہی تعلیم پا کر اب یونیورسٹی کا بیڑا غرق کر رہا تھا۔

سجان سنگھ میں قناعت اور کشادہ دلی تھی۔ اس نے سلمان کی طرف دیکھنے کی بجائے گلی کے منظر کو تکنا شروع کر دیا۔ پھر کچھ ہی دیر میں اس منظر سے اکتا کر چپ چاپ اپنی گلی کی طرف چل پڑا۔ پرانی دہلی بلکہ قدیمی دہلی کا یہ علاقہ ابھی تک مسلمانوں کی عظمت سے لے کر موجودہ غربت تک ویسے کا ویسا ہی تھا۔ جیسا آج سے دو سو سال قبل تھا۔ سجان سنگھ کے خاندان کو اس کے دادا کے ایک کائستھ ہندو دوست نے کلن محل گلی میں ایک مکان میں بیٹھا دیا تھا۔ جب وہ تین سال قبل کشمیر سے نقل مکانی کر کے دہلی آئے تھے۔ 120 گز کا یہ قدیمی مکان چونے کا بنا ہوا تھا اور تقسیم کے بعد سے بند پڑا تھا۔ اب 3 سال سے سجان سنگھ اور اس کا دادا، دادی، ماں اور ایک بہن اس مکان میں رہتے تھے۔

سجان سنگھ کلن محل گلی کے طرف مرکزی بازار میں سے ٹہلتا ہوا گیا اور قریب 9 بجے گھر پہنچا۔ گھر میں شروع سے ہی وہ بالائی منزل کے باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے کمرے میں رہتا تھا۔ سردی گرمی اس کا کمرہ یہی تھا۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ باقی گھر والوں کو تنگ

کئے بغیر آ جا سکتا تھا۔ شروع میں یہ سوچ بھی تھی کہ جب وہ یہاں گلی میں ساتھ کے علاقہ میں دوست بنانے لگا تو ان کو آنے اور ملنے میں بھی سہولت رہے گی لیکن اس علاقہ میں سب مسلمان تھے یا کوئی کوئی ہندو گھر تھا۔ مسلمان تو ویسے ہی اپنے محلّہ میں موجود مسلمانوں تک کے بارے میں شکی رہتے تھے اور عجیب سا سہمہ سہمہ رویہ، ہندو بھی ضرورت سے زیادہ محتاط تھے۔ ذرا سے مسئلے پر فوراً چوکی میں درخواست دے آتے اور پولیس عام طور پر ہندو کو حمایت کرتی تھی۔ اس لئے مسلمان ان سے دل میں دبتے تھے لیکن ویسے موڈ دکھاتے تھے۔

ان حالات میں سبحان سنگھ کی کسی سے کیا دوستی ہونا تھی اور کیا دشمنی۔ وہ اکیلا ہی پھر کر آ جاتا۔ شروع شروع میں کسی کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی منفرد قسم کے مسائل تھے۔ دہلی آ کر اس نے بال بھی کٹوانے شروع کر دیئے تھے تا کہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہو۔ یہ اس کے دادا کی تجویز تھی۔

ابھی وہ کمرہ میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی دادی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ دادی اس کی بہنوں کو گرونانک کی اوائل عمری کے واقعات سنا رہی تھی۔ دادی کی اب دو ہی مصروفیات تھی۔ ایک گرنتھ صاحب کا جاپ کرنا، جس میں گرو کے احوال زندگی اور صوفیاء کی شاعری تھی اور دوسری مصروفیت تھی ''موت کا انتظار کرنا''۔ دادی بڑی مضبوط خاتون تھی۔ ساری زندگی حوصلہ میں رہی۔ اس دن کے علاوہ کبھی سر عام نہ روئی جس دن اس کے باپ کو انتہا پسندوں نے ملکہ کے قتل کے بعد ہونے والے فسادات میں مار دیا تھا۔

آج سبحان سنگھ کا دماغ غنودگی کی حالت میں تھا اور چنانچہ جلد سو گیا حالانکہ عام طور پر وہ آدھی رات کے بعد سوتا تھا۔

صبح کے 4 بجے اس کی آنکھ کباب والے کے ہانکے سے کھلی۔ پرانی دہلی کی تنگ اور قدیم

تاریک گلیوں میں ابھی تک قدیمی خیالات کے مسلمان اوران کی تہذیب پڑے سسک رہے تھے۔ کئی صدیوں سے دہلی میں رواج تھا کہ ناشتہ میں لوگ ہانکے والے سے محلّہ کی دوکان سے کوئی شے منگواتے تھےاور کھاتے تھے۔ زبان کا چسکا دہلی کے پرانے رہنے والوں کی ایک خوبی تھی اور چار عالم میں مشہور تھی۔

آج سبحان سنگھ کا دل دہی کی لسی کو چاہ رہا تھا، وہ اُٹھا اور باہر نکلا۔ اس کے سامنے ہی حکیم اکمل علی کی حویلی تھی۔ حکیم صاحب کے جد امجد منشی فاضل تھے اور مغل دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی بیگم عائشہ بی بی رام پور کے نواب کے خاندان سے تھی اور پرانی رکھور کھاو والی خاتون تھی۔ سبحان سنگھ کی والدہ کا عائشہ بی بی کے ہاں آنا جانا بن چکا تھا۔

سبحان سنگھ سیڑھی سے اتر کر باہر نکلا تو سامنے ہی حکیم اکمل علی اپنے دروازے میں کھڑے تھے۔ اس نے ان کو دیکھ کر سلام کیا۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور کہا'' ارے سبحان میاں! کہاں جاتے ہو صبح صبح ہی۔ اماں ادھر آؤ۔ تمہارے لئے بھی ناشتہ کہے دیتا ہوں ۔سبحان نے سوچا، حکیم صاحب بھی اس کی طرح زوال پذیر خاندان سے ہیں اور خود آنہ آنہ کے محتاج، کیوں ان پر بوجھ ڈالوں۔ کہا''نہیں چچا! مجھے بازار میں کچھ کام ہے مجھے ابھی ناشتانہیں کرنا ۔حکیم صاحب نے کہا' جا بیٹا! اللہ کے سپرد۔ سبحان مین بازار میں نکلا تو پائے والے، کباب والے اور نہاری والوں کی ریڑھیوں سے بازار بھرا تھا۔ پرانی دہلی کا مقابلہ کم از کم کباب میں کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ فاقہ کر لیتے تھے لیکن سادہ نہ کھاتے تھے۔ صبح صبح لگتا تھا کہ سارا عالم ہی اس بازار میں نکل آیا ہے۔

سبحان سنگھ نے لسی پی اور واپس گھر آ گیا۔ صحن میں جب داخل ہوا تو پورا صحن دھواں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی ماں اب بھی ولایتی گھی سے کلٹی کر کے پراٹھے بناتی تھی اوران سب کو دیتی تھی۔ یہ اس کی اس وقت سے عادت تھی جب دادا نوکری اور باپ کاشتکاری کے لیے صبح صبح

نکل جایا کرتے تھے لیکن اب تو پورا گھرانہ ہی کچھ نہ کرنے میں مصروف تھا۔ پھر بھی جب تک پاؤ گھی توے پر نہ جل جائے اور دھواں سے پورا صحن نہ بھر جائے تب تک اس کی ماں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔

صحن میں لگی گرو ارجن سنگھ کی شبیہ اس دھواں کی وجہ سے دھندلا گئی تھی۔ روز صبح اس کا دادا سنگھ سرکاری تصویر کا دھندلا جانا نوٹ کرتا، پھر چپ چاپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھ جاتا جو کہ اس کو دیکھ کر ہولے سے کہتی تھی" آ گئے ہو جی۔۔۔"

اور آگے سے دادا جی کہتے:۔ جی آ گئے تسی ٹھیک جے۔

وہ سر ہلا کر کہتی: واہے گرو کی جئے۔

دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن دونوں میں کم وبیش یہ مکالمے روز ہی ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس کی دادی گرنتھ صاحب کے اشلوک پڑھتی رہتی اور دادا جی چپ کر دھیان سے سنتے رہتے اور ہلکا ہلکا راگ سری گنگناتے رہتے۔ اس کے بعد ماں بنیرے پر باجرہ ڈالتی اور مٹی کے برتنوں میں پانی ڈال دیتی۔

آنند پور صاحب میں جب وہ رہتے تھے ان کے گھر کے سامنے ہی گوردوارہ تھا، اس کے بنیرے پر بھی اس کے باپ سیوادار بھائی بندہ سنگھ روز صبح باجرہ اور ٹوٹا ڈالا کرتا تھا۔ یہ ریت اور رواج اس وقت بھی موجود تھی۔

سیوا ردار بھائی بندہ سنگھ اکثر کہا کرتا کہ" یہ پنچھی رب سچے کی ثناء کرتے ہیں۔

وہ رب سچا جس کا روپ ہر شے میں ہے۔

وہ جس نے ہر ایک کو ایک طرح اور ایک جیسا بنایا ہے۔

اور ایک جیسی دنیا میں بھیجا۔

وہ جو سب کا مالک ہے۔

وہ جو سب کے پالن ہار ہے۔

وہ جو سب سے پیار کرتا ہے۔

وہ جو صرف انسانوں کو انسان بناتا ہے۔

ان کو ایک دوسرے کے ساتھ سلوک سے رہنے کا کہتا ہے۔

یہ چرند پرند بھی اس کی ثناء کرتے ہیں۔

نور حضور کے وقت اور ان کی خدمت سعادت ہے۔''

اس کے مارنے کے بعد بھی سجان سنگھ کی ماں نے یہ ڈیوٹی چھوڑی نہیں بلکہ پہلے کشمیر اور اب دہلی میں بھی یہ رسم رواج ریت یا جو بھی یا کچھ بھی نہیں، یہ جاری تھی۔ سجان سنگھ دو باتیں اپنے خاندان میں واضع محسوس کرتا تھا ایک یہ کہ خاندان کے تمام افراد اپنی عادات کے ہاتھوں مجبور ہیں اور دوسرا یہ کہ ایک کامل دکھ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے دادا کے ساتھ زندگی بہت سختی کے ساتھ پیش آئی تھی۔ وہ تقسیم کے وقت لاہور میں تھا پھر وہ تقسیم کے دوران فسادات کے ریلیف پروگرام میں مصروف تھا کہ جب اس کا بڑا بیٹا اپنے خاندان کے ساتھ آنندپور کی طرف نقل مکانی کر رہا تھا کہ واہگہ کے پاس مارا گیا۔

وہ خود اس وقت آسام میں تھا کہ خاندان تمام جمع پونجی لٹوا کے اور ایک لاش کے ساتھ آنندپور پہنچ گیا۔ واپسی پر گھر آیا تو دوسرے بیٹے نے کہا کہ وہ اپنی زندگی سیوا کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے اور اکال تخت چلا گیا۔ چند سال بعد آنندپور میں گوردوارہ بھائی تمبو سنگھ میں آ گیا اور تمام عمر وہیں پر رہا۔ یہاں تک کہ جب گولڈن ٹمپل کی تعمیر نو کے لئے رضاکار کے طور پر گیا تو وہیں ملکہ کے قتل کے بعد ہونے والے فسادات میں مارا گیا۔

خود سرکاری، سرکاری نوکری کے لیے دہلی اور اُس کے بعد یونین منسٹری سٹاف کی طرف سے ملک بھر میں گھومتا رہا اور رزق کی تلاش میں جدوجہد میں مصروف رہا اور پھر چار دفعہ کی نقل مکانی کے بعد دہلی میں آیا۔

اس کا دادا اکثر سوتے ہوئے بھی گزرے واقعات کے مکالمے دوہرانے لگ پڑتا تھا۔ کبھی بے وجہ بہت زیادہ خوش ہو جاتا اور کبھی غم زدہ۔ وہ اس کے بعد کچھ دیر بیٹھا اور پھر یونیورسٹی کے لئے گھر سے نکل پڑا۔

اس وقت اس کی دادی پرارتھنا کر رہی تھی اور دادا جی سوچ میں گم اور اس کی ماں بنیرے پر دانہ چگتے ہوئے پرندوں کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ سبحان سنگھ کو باہر گلی میں آ کر یاد آیا کہ بالوں کو نہیں بنایا۔ اس نے بے خیالی میں قدم بڑھتے ہوئے ہاتھوں سے کسی حد تک سنوار لیا اور چلتا چلا گیا۔

آنند پور صاحب بازار میں آج معمول سے زیادہ رش تھا۔ آج وہاں پر سکھوں کے تمام بڑے گرنتھی اور اکالی لیڈر جمع تھے۔ دلمیر سنگھ سرکاری حسب معمول سب سے پہلے وراثت خالصہ گیا اور وہاں پر قدیم صحیفوں کی زیارت کی۔

آج سنت جرنیل سنگھ جی نے بھاشن دینا تھا اور پورے پنجاب سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اندرا راج اپنے عروج پر تھا اور سکھ کمیونٹی میں علیحدگی پسندوں کا کھلم کھلا گروپ سنت جرنیل سنگھ جی کی قیادت میں کھڑا ہو رہا تھا۔ دلمیر سنگھ بھی اب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو کر اپنا زیادہ وقت مذہبی عبادات اور تقریبات میں ہی گزرتا تھا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرآلہ والا تمام سکھ گروپ کے ساتھ ایک معاہدہ کر رہے تھے جس میں مذہب اشعار کی بحالی اور آئین کے آرٹیکل 25 کی مخالفت شامل تھی۔ جس میں سکھ مت کو ہندوازم کا حصہ قرار دیا گیا تھا۔ ان کی تحریک میں کسی کو قتل کرنے والوں نوجوانوں کی اصلاح بھی سرفہرست تھی۔ دلمیر سنگھ سرکاری اس دن موقع پر ہی تھا، جب آنند پور قرارداد منظور ہوئی۔ اکالیوں سمیت سب نے بنیادی نکات پر اتفاق کر کے دستخط کر دیئے۔ آنند پور صاحب قرارداد کی اپنی تشریح تھی اور ہر کوئی اس میں سے اپنے مطلب کے مطالبات کی منظوری چاہتا تھا۔ لیکن پنجاب کی سیاست کا رخ اس قرارداد نے بدل دیا۔ سکھوں میں ہر کمیونٹی کی طرح دو طبقہ تھے۔ ایک

اشرفیہ اور دوسرا عوام لیکن اس قرارداد کے بعد اشرافیہ نے عوام کی زبان بولنا شروع کی۔

پنجاب میں بنگلہ دیش کی جنگ کے فاتح فوجیوں کی بڑی تعداد واپس آ چکی تھی۔وہ اپنے آپ کو ایک اچھا جنگجو سمجھتے تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی بڑی تعداد سنت جرنیل سنگھ کی ہی طرف کشش محسوس کر رہی تھی اور عوام کا ہجوم اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔دلبیر سنگھ نے بھی بھاشن سنا اور دل میں خوش ہوا اور اسی شام ٹرین سے واپس دہلی چلا گیا۔اس نے دہلی اسٹیشن پر چندی گڑھ ریڈیو سے سنا کہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوگئی ہے۔اس کو لگا کہ اب پنجاب کے تمام کسان خوشحال ہو جائیں گے۔اس نے جامع مسجد کے باہر سے قدیم سویٹس سے ایک کلو خالص گھی کے لڈو خریدے اور گھر والوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ اب خوشحالی آئی ہی چاہتی ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی کامل یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔انہوں نے نہایت عقیدت سے مٹھائی کھائی اور اس رات دیر تک وہ اسی موضوع پر بات کرتے کرتے سوئے۔

عام سکھ گھروں میں یہ رائے اب مستحکم ہوتی جا رہی تھی کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے راج کو روکا پھر انگریزوں نے جب بھی پنگا لیا ان کو معقول جواب دیا۔تعمیرات، مصوری، جنگ جو، تعلیم اور منصوبہ بندی ہر ہر طرف سے ہماری کارکردگی اچھی رہی۔تمام جنگوں میں ہمارے کمیونٹی نے ہراول دستی کا کردار ادا کیا لیکن ہمارے ہی صوبہ کو توڑ دیا گیا۔عام کسان کو پورا پانی تک نہیں ملا۔

دلمیر سنگھ سرکاری آبادکاری کمیشن کے ختم ہو جانے کے بعد فارغ تھا۔نئی دہلی میں ہی ایک کرایہ کے کمرہ میں مقیم تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب دوبارہ کسی سرکاری محکمہ میں کھپ جائے۔وہ سارا دن مختلف دفاتر کے چکر لگاتا لیکن ہر جگہ ممبر لوک سبھا یا وزیر کی سفارش یا پھر مقابلہ کے انواع اقسام کے امتحانات کا سلسلہ۔

مسلسل دھکے کھانے کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ یونین کابینہ کے کسی سکھ وزیر تک کسی نہ

کسی طرح پہنچا جائے۔ اگلے دن سردار سورن سنگھ کے دفتر گیا اور وہاں پر اپنا نام لکھوا آیا اور ابھی واپسی کے لیے نکل کر مرکزی عمارت کے گیٹ پر ہی تھا کہ اس کو گورکھے سپاہی نے پیچھے سے آ کر کہا کہ وہ ملاقات کے لیے آ جائے۔

گورکھے سپاہی نے دلمیر سنگھ کو ایک گنوار دیہاتی سمجھ کر وزیر صاحب سے ادب سے پیش آنے اور دیگر پروٹوکولز سمجھائے۔ غرض وہ بے چارے دلمیر سنگھ کو اتنا زیادہ دباؤ کے تحت لے آیا کہ جب اس نے دلمیر کو یونین منسٹر آف انڈیا کے قریب 20 فٹ لمبے کمرہ میں دھکیلا تو اس لمحہ دلمیر سنگھ بالکل ہی بھول چکا تھا کہ وہ کیا بات کرنے کے آیا تھا۔ بڑے سادہ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک بڑی ساری میز کے دوسری طرف ایک پچاس کے پیٹے میں عینک والا سردار جس کی داڑھی سیاہ کالی تھی ،کسی فائل کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ دلمیر ڈر کر اس کے کمرہ کے دروازے کے ساتھ ہی رک گیا۔

کچھ دیر تک سورن سنگھ فائل سے لگا رہا پھر اچانک دروازہ کی طرف دیکھا تو بولا: سردار جی! سری اکال! آؤ بیٹھو۔ کیسے آئے؟

دلمیر سنگھ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سب کچھ ایک ہی ہلے میں بول دیا ۔

سورن سنگھ نے ان کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی گھنٹی پر اپنا بوٹ مارا۔ دلمیر سنگھ کی داستان اتنی جامع تھی کہ سورن سنگھ کو ایک بھی سوال پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ کچھ دیر میں ایک آدمی دفتری ڈائری لے کر آیا۔ اس کو سردار سورن سنگھ نے کہا کہ شیوا! سردار کا پتہ لکھ لو اور نئے بنانے والے سپلائی محکمہ میں ان کے آرڈر کرنے ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولا بلکہ ایسا کرو ابھی میرے سٹینو کے طور پر اسی محکمہ میں ہی اس کے آرڈر ٹاپ کر کے لے آؤ اور ہاں اچھی سی چائے بھی بھیجو۔ پھر دوبارہ فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دو چار فائلوں کو نمٹا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: سردار جی! آپ کے چائے پیتے تک آپ کے آرڈر آ جاتے ہیں۔ آپ کے آرڈر ابھی میں نے یونین منسٹری سٹاف کر

دیئے ہیں۔ بعد میں بہت سے نئے محکمہ بن رہے ہیں، کسی اور میں کھپا دیئے جاؤ گے۔ یہ کون سا کوئی مسئلہ ہے۔۔۔۔اور ساتھ ہنستے ہوئے کہا اور کوئی حکم؟

دلمیر سنگھ نے کہا: سردار جی! گورو آپ کی شان بڑھائے۔ میرا یہی کام تھا اور وہ ہو گیا۔ میرے لیے یہ ہی سب کچھ ہے۔ سورن سنگھ مسکرا کر کمرہ کی چھت کی طرف متوجہ ہو گیا اور کچھ دیر بعد دوبارہ گھنٹی پر پاؤں مارا تو سٹینو تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور فائل سامنے رکھ دی۔

سورن سنگھ نے ایک نظر دھیان سے ہندی میں لکھے آرڈر کو پڑھ اور صرف ایک لفظ کاٹ کر اس کو اپنے ہاتھ سے دوبارہ دیگر لفظ لکھ کر فائل واپس کر دی اور کہا کہ سردار جی! آپ ساتھ جاؤ اور اپنے آرڈر لے کر ابھی کاروائی مکمل کر کے واپس گھر جانا اور اس کے بعد خود بھی دفتر سے نکل گیا

شیوا رسردار سورن سنگھ کے نکلتے ہی اعتماد میں آ گیا اور فوراً پوچھا کہ آپ سردار جی کے حلقہ کے ہو؟؟

اس دوران دلمیر کی نظر اپنی تقرری نامہ پر تھی اس نے دھیان سے دیکھا کہ ایک لفظ جس پر لکیر لگا کر سردار سورن سنگھ نے دوبارہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا وہ لفظ تھا کہ عارضی طور پر اس کو کاٹ کر سردار سورن سنگھ نے مستقل طور پر کر دیا تھا۔ اور س طرح دلمیر سنگھ ''سرکاری'' ہو گیا۔

لیکن ابھی جب دلمیر سنگھ نے سرکاری نوکری شروع کی۔ بانی قیادت زندہ تھی۔

اور آج کل سیکرٹریٹ میں گرم موضوع تھا۔ نئے ملک کی قومی زبان۔

جن یونین منسٹرز کو یہ ٹاسک ملا تھا کہ وہ کمیشن کا فیصلہ پر اتفاق رائے کروائے۔ وہ سیکرٹریٹ میں سہمے ہوئے پھرتے تھے۔ لوک سبھا نے کئی سال کی بحث کے بعد اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا تھا کہ ہندی پر اتفاق رائے ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ سارا مسئلہ دوبارہ سے وہاں ہی جا پڑا ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔

دلمیر سنگھ بھی اپنے کاغذات کا اندراج کروا کر اس سارے مسئلہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے صوبہ میں حد بندی اور زبان اور رسم الخط کا مسئلہ اب خبروں میں آنے لگ پڑا تھا۔ وزیر اعظم کے حامی اور مخالفت کرنے والے یہ کہہ رہے تھے کہ اس مسئلہ کو ابھی اٹھانا نہیں چاہیے تھا۔ جبکہ حمایتی گروپ کا خیال تھا کہ زبان بنیادی شناخت ہے قوم کی اور ملک کی۔ اور انگریزی سامراج کی علامت ہے۔ اس لئے یہ ٹھیک ہوا ہے۔ اور وقت بھی ٹھیک ہے۔

پنجاب میں یہ مسئلہ اس لئے بھی شدید تھا کہ پنجاب میں سکھوں کا اپنا مذہب اپنا رسم الخط اور زبان تھی۔ وہ تو انگریزی پابندی کے قائل تھے ہی نہیں لیکن ابھی دہلی میں جنگ دو فریقوں کے درمیان تھی۔ ایک تھا ہندی بولنے واالا اور دوسرے تھے جنوب والے۔ وہ اپنے علاقائی فرق کے باوجود صرف ہندی کے خلاف اکٹھے تھے۔ پنجاب کا مسئلہ ابھی بعد میں ابھرنا تھا۔ اور اسے ہندوستان کا مرکزی مسئلہ بھی بننا تھا۔

ہندوستان کا مرکزی مسئلہ بنا تھا، لیکن بھائی بعد کی بعد میں۔ ابھی کی ابھی سیکرٹریٹ میں بھی کشیدگی تھی۔ لوگوں کو اپنا صوبہ اور زبان اب زیادہ یاد آنے لگے تھے۔ لوک سبھا کے ممبرز اور مرکزی وزراء بھی کانگریس کی پارٹی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بھی پہل کرنے سے ڈر رہا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ کوئی بھی اپنے موقف سے پیچھے بھی نہیں ہٹ رہا تھا۔ دلمیر سنگھ نے اسی سب میں بعد دوپہر کی چائے وہاں دفتر میں اپنے اندر انڈیلی اور چند بسکٹ اور پھر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا

اگلے دن دلمیر سنگھ نئی دہلی کی سڑکوں پر پیدل مارچ کرتا ہوا سیکرٹریٹ پہنچا۔ شیوا جی سپر نٹنڈنٹ اپنے دفتر میں نہیں تھے۔ اس نے دفتر کے اگلے حصہ میں چکر لگایا تو پتہ چلا کہ آج سردار سورن سنگھ بھی نہیں آئے۔ اپنے کمرے آکر شیواء جی کا انتظار کرنے لگا۔

دفتر میں کشمیری چپراسی عبدل نے اس کو دودھ پتی کے ساتھ بسکٹ پیش کئے تو وہ بڑا اراضی

ہوا۔ دلمیر نے سوچا، وہ تھوڑی دیر عبدل کے ساتھ تعارف کرتا ہے۔

عبدل نے بتایا کہ وہ کشمیر کا رہنے والا ہے لیکن تقسیم سے قبل دہلی آیا اور یہاں پر سیکرٹریٹ میں چپراسی بھرتی ہو کر دہلی میں ہی رہتا ہے۔ عبدل نے آہستہ آہستہ اس کو دفتر میں نچلے طبقے کی گروپ بندی کی تفصیل سے آگاہ کیا اور سردار کا بھی مکمل ڈیٹا حاصل کیا کیونکہ اس کا اصل مقصد یہی پتہ کرنا تھا کہ سردار دلمیر سنگھ سرکاری وزیر صاحب کا کتنا خاص ہے

عبدل کو یہ یقین تھا کہ یہ سردار یقینی طور پر وزیر برائے یونین گورنمنٹ کا کوئی نہایت قریبی ہے ورنہ کون آج کل کسی کو فوراً نوکری دیتا ہے اور جس طرح ایک دو دن میں تمام آرڈر ہو گئے تھے اس پر خود دلمیر سنگھ کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ یہ سب بہت زیادہ ہی جلدی ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ اب ہر پراتھنا کے بعد سردار سورن سنگھ جی کے لیے خصوصی پراتھنا کرے گا۔ جس نے صرف فرقہ وارانہ مماثلت کی بنیاد پر اس کا اتنا بڑا کام کر دیا۔ دلمیر سنگھ کے لیے تو یہ بڑا کام ہی تھا۔ اس کے روزی چھت کا مسئلہ حل کر دیا۔ اور وقت جیسے رک گیا تھا۔ نہ شیوا جی آ رہا تھا اور نہ ہی سردار سورن سنگھ کی آمد کے کوئی اثرات تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ آج دفتر سے جلدی فارغ ہو کر گوردوارے جائے اور وہاں پر کچھ دیر گزارے۔ بہت دن سے وہ گوردوارے نہیں گیا تھا۔

اس کی زندگی میں نظم وضبط کی بہت کمی تھی۔ خاص طور پر بے کاری کے ایام میں تو اس کی روزمرہ کی زندگی کا معمول ہی بے وقتی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سوچا اپنے آپ کو دفتر سے اور اردگرد سے متعارف کروانا چاہیے۔ ابھی وہ باہر نکلا ہی تھا کہ عبدل دوبارہ نظر آیا۔ وہ اس کی طرف آیا اور آہستہ سے بولا کہ یہ زبان کا مسئلہ اب دوبارہ تو نہیں چلے گا۔

اس کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا، جس میں ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل راجہ جی جو جنوب سے تھے، کا پرانا مضمون شائع ہوا تھا جس میں راجہ جی نے ہندی کی حمایت کی تھی لیکن اب انہوں نے ہندی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ یہ مضمون کئی سال پرانا تھا لیکن آج کشیر

الاشاعت اخبار میں دوبارہ شائع ہوا تھا اور اس اخبار کی ادارت بھی آج کل ایک نمایاں ترین شخصیت کے صاحبزادہ کے پاس تھی۔

بہرحال اس کو عبدل نے بتایا کہ آج دوبارہ اجلاس ہے اور سردار سورن سنگھ سمیت تمام وزراء کابینہ کے اجلاس میں مصروف ہیں۔ عبدل اخبار اس کو دے کر چلا گیا۔ دلمیر سنگھ عموماً اخبار کم ہی پڑھتا تھا۔ اس وقت ہندی بولنے والی ریاستوں کی قیادت یو پی کا ایک سابقہ اسمبلی سپیکر جبکہ دوسری طرف راجہ جی تھے، جنوبی ریاستوں کی قیادت کرنے والے آج کا اخباران خبروں سے پر تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ سردار سورن سنگھ جی دفتر پہنچ گئے ہیں۔ اس کو چونکہ نوکری کا تجربہ تھا۔ اس لئے سوچا کہ کچھ دیر ٹھہر کر جاتا ہوں۔ وزیر کے آتے ہی متعلق افراد اور کلرکوں نے ان کے دفتر کے باہر رش کر لیا۔ ہر کوئی نمبر وار اندر جاتا اپنے کاغذات ملاحظہ کرواتا اور حکم لیتا اور باہر آتا پھر دوسرا جاتا اور کاروائی کے بعد باہر آتا پھر تیسرا اس طرح یہ صبر آزما سلسلہ چلاتا رہا۔

یہاں تک کہ دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر کی آمد ہوئی برائے ملاقات سردار سورن سنگھ۔ یہ دیکھ کر اس کو لگا کہ آج پھر اس کا کام مکمل نہیں ہوگا۔ گورنر صاحب اپنے ملٹری سیکرٹری اور دیگر دو افراد کے سیدھے اندر چلے گئے۔ اب سوچ سوچ کر اس نے اردلی کو جا کر سردار دلمیر سنگھ نے کہا سردار جی! میری پرچی اندر سورن سنگھ جی کو دے دو براہ مہربانی۔

پہلے تو اس نے دلمیر سنگھ کو گھورا۔ لیکن دلمیر سنگھ نے فوراً زیر لب کہا کہ واہے گرو جی کا خالصہ۔ گرو کی جئے۔

یہ سن کر اس نے اپنے سر کو ہلکا سا ہلایا اور آنکھ کے اشارے سے کہا کہ وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو جائے اور خود چائے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ پھر واپسی پر آتے ہی کہا کہ سردار جی! جلدی سے اندر جاؤ۔

اندر سردار سورن سنگھ اور گورنر کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

دلمیر سنگھ چپ کر کے دروازے کے پاس ہی با ادب کھڑا ہو گیا۔ وہی زبان کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ گورنر صاحب کہنے لگے کہ سوامی مدالیار جی نے کہا کمیٹی میں کہ ہم جنوب والے ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کی آئینی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن 1965ء کی تاریخ کو ترمیم میں سے نکال دیا جائے۔ طویل عرصہ تک دونوں زبانوں کے استعمال سے عوام میں ہم آہنگی اور خوف کم ہو گا جبکہ 26 میں سے صرف 2 نمائندہ ہی ایسے ہیں جو کہ انگریزی کو ہی حسب سابقہ ہندوستان کی سرکاری زبان بنا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کسی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ کمیٹی دنیا بھر کے لسانی نظام کا فیصلہ کرنے جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ برصغیر کے ایک ارب لوگ ہی ہیں۔ جنہوں نے انگریزی کو اس کے صحیح تلفظ اور لہجہ کے ساتھ دل و جان سے قبول کر کے اس کو دنیا کی سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان بنا دیا ہے اور اس لسانی کمیشن کی سفارشات پر اگر عمل درآمد ہو جاتا تو آج دنیا میں اطلاعات کا نظام اور لسانی نظام دونوں مختلف ہوتے۔

سورن سنگھ تمام باتیں آرام سے سن رہے تھے۔

گورنر صاحب بتا رہے تھے کہ کمیشن میں مسئلہ کے فوری حل کے لیے زبان کی بنیاد پر ملازمین میں کوٹہ منظور کر کے ہندی نافذ کرنے تک کی تجویز زیر غور آئی۔ جس کو کمیشن میں موجود وزراء نے فوراً اس بنیاد پر رد کر دیا کہ یہ کوٹہ زبان تک محدود نہیں رہے گا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں جائے گا۔ اور آگے چل کر شائد اس سسٹم کا اثر قومی یک جہتی پر بھی پڑے۔ اس کے بعد اس تجویز کے دینے والے ہی اس سے ہٹ گئے بلکہ معافی مانگی۔

اس دوران اچانک سردار سورن سنگھ کی نظر پڑی کہ یہ کون کھڑا ہے اور کہا: ہوں! سردار جی! تُسی ہوں۔ آپ ایسے کرو کہ آپ جو بلاک 5 میں نیا محکمہ برائے سپلائی بن رہا ہے۔ وہاں کل جا کر راما سیوا جی کو میرا سلام کہنا اور وہاں جوائن کر لو۔ میں نے آپ کی بات کر لی ہے۔ یہ سن کر دلمیر سنگھ نے ہاتھ اوپر کر کے سلام کیا اور چپ چاپ اُلٹے قدم باہر نکل گیا اور پیدل ہی اپنے کوارٹر کی طرف چلنا

شروع کر دیا۔ دوپہر کے آخری پہر کا آخری حصہ تھا اور نئی دہلی کی سڑکیاں اس گھڑی ٹھنڈیاں تھیں۔

اگلے دن دلمیر سنگھ مجوزہ پتہ پر اعلی الصبح ہی پہنچ گیا۔ وہاں ابھی کوئی بھی نہ آیا تھا۔ حسب معمول وہ چپ کر کے بیٹھ گیا اور نئی دہلی کی زندگی پر غور کرنے لگا۔ انگریز نے جب پرانی دہلی کے ساتھ ایک نیا شہر آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت بنیادی مقصد یہ تھا کہ پرانے شہر سے الگ وعلیحدہ اک خالص سرکاری شہر بنایا جائے۔

اس وقت شائد نئی دہلی کے خواب دیکھنے والے کو بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ شہر اتنا پکا سرکاری شہر ویران وبے حس بن کر ابھرے گا ۔نئی دہلی اپنے قیام کے پہلے پچاس ساٹھ برس ایسا ہی شہر رہا لیکن پھر آبادی کے پھیلوں نے اس کو بھی عوامی شہر بنا دیا

قریب 10 بجے دلمیر سنگھ سرکاری کے پرانے دفتر کے دوست محبوب صاحب آئے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ جگجیت سنگھ نام تھا اس کا۔ بعد از تعارف یہ پتہ چلا کہ محبوب صاحب نئی بننے والی انڈین ایڈمنسٹریشن سروس میں کمیشن لے کر اس نئے محکمہ میں تعینات ہوئے اور سردار جگجیت سنگھ بھی اس کے ساتھ ہی کمیشن لے کر اور اسی محکمہ میں تعینات ہوئے ہیں۔ دونوں راما سوامی کے لئے اپنے لیٹر لے کر آئے بیٹھے تھے۔ بلاک پانچ میں بہت سے کمرے اور تیسری منزل مکمل محکمہ سپلائی کو دے دی گئی تھی۔ راما سوامی مدارس کے رہنے والے تھے اور انگریز کے دور کے آئی سی ایس افسر تھے اور ان کے کندھوں پر اس نئے محکمہ کو بنانے اور پھر چلانے یعنی رواں کرنے کے رہنے کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔

گیارہ بجے کے آس پاس قریب 25/30 لوگ اس دفتر میں آچکے تھے۔ جن کی اس محکمہ میں تعیناتی ہوئی تھی۔ اور وہ اب انچارج صاحب جن کا موجودہ عہدہ ڈائریکٹر تھا، کے انتظار میں تھے کہ وہ آئے اور ان کو ان کی ڈیوٹی سے آگاہ کر دے۔

بارہ بجے راما سیوا جی اور ان کا ذاتی عملہ جو کہ 3 افراد پر مشتمل تھا، بالآخر پہنچ گئے ۔ وہ ایک درمیانے سے بھی کچھ کم قد کے روایتی مدراسی تھے لیکن چہرہ پر تجربہ اور عہدہ کی سنجیدگی اور اظہار تھا۔ ان کو دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ راما سوامی آئی سی ایس ہیں اور بڑے افسر ہیں۔

نئی دہلی میں انڈیا کے ہر علاقے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ہر دفتر میں ملٹی کلچر ماحول عام سی بات ہے۔ اسی طرح اس دفتر میں کلرک پنجابی سکھ درجہ چہارم مسلمان کشمیری افسران جٹ سکھ دوسرا آسام کا مسلمان تیسرا مدراس کا ہندو یہ تھی ثقافتی تقسیم اس نئے محکمہ کے نئے دفتر کی۔ کمال کا ذہن تھا اس کا جس کو فرنگی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اس نے اس تمام لوگوں کو سسٹم اور پروٹوکول میں بالکل سیدھا بندھا اور چلادیا اور ایسا عادی کر دیا کہ اس کو جلاوطن کر کے بھی مقامی آبادی اسی کے نظام حکومت کو چلا رہی تھی۔ کسی نے بھی سابقہ مغل دربار یا مرہٹہ سرکار کا درباری نظام بحال کرنے کی غلطی سے بھی مطالبہ نہ کیا۔

راما سوامی جو کہ ابھی ابھی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن سے سیکرٹری سروسز گورنمنٹ آف انڈیا کے آرڈر لے کر آرہے تھے۔ فوراً ہی ان کے ۳ رکنی عملے نے دفتر کا انتظام سنبھال لیا اور تمام 5 افسروں کو لے کر راما سوامی سیکرٹری نے میٹنگ شروع کر دی۔ کمال کی ٹریننگ تھی آئی سی ایس وہی صرف دس منٹ میں رام سوامی نے میٹنگ کا ایجنڈہ بنا کر ٹائپ رائٹر سے لکھوا کر فوراً افسروں کے سامنے رکھوایا۔

ایجنڈہ میں محکمہ کے افسران کی ذمہ داروں کا تعین اور عملہ کی تقسیم سرفہرست تھے۔ اور پھر سپلائی کا محکمہ جو کہ یونین کا ایک بنیادی محکمہ ہوتا ہے۔ اس کے طویل معاملات دیگر وہ تو تھے ہی۔ ان دنوں مختلف اتحادی ممالک سے امداد کی بھی توقع تھی۔ اور پھر یونین کے مختلف علاقوں میں اجناس کا میزان ٹھیک رکھنا بھی اسی محکمہ کی ذمہ داری ہونا تھی۔

لیکن ابھی تو محکمہ کی بنیادیں رکھی تھی۔ پالیسی آف سپلائی بنانا تھی اور پہیہ رواں کرنا تھا اور

دفتر کی کل سیدھی کرنی تھی۔ میٹنگ کے بعد دلمیر سنگھ کی ڈیوٹی محبوب صاحب کے ساتھ لگا دی گئی۔ اور ان کو نچلے والی منزل پر ایک کمرہ دے دیا گیا۔ وہاں پر محبوب صاحب اپنے دونوں عملہ کے اراکین کے ساتھ فوراً ہی چلے گئے۔

کمرہ مدت سے بند پڑا تھا۔ وہاں موجود چوکی داروں نے بتایا کہ یہ کمرہ دوسری جنگ عظیم کے سپلائی ڈپو کے اہلکار استعمال کرتے تھے۔ اب یہ اس کے بعد آپ لوگوں نے کھولا ہے۔ محبوب صاحب نے اپنے عملہ کے دونوں اہلکاروں دلمیر سنگھ سرکاری اور ویر پرتاب جو کہ ایک منشی فاضل پاس کائستھ ہندو تھے اور ان کی یہ تیسری نسل تھی جو کہ سیکرٹریٹ کے کام میں مصروف تھی۔

محبوب صاحب نے دونوں کو کہا کہ کل سے آپ لوگ صبح ٹھیک ۸ بجے آ جاؤ اور ساتھ ہی عمارت کے نگران کو صفائی کی ہدایات جاری کیں اور اس کے بعد خود چلے گئے۔ اس کے بعد دلمیر بھی پیدل ہی اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑا۔

دلمیر سنگھ سرکاری کو نکالتے ہوئے ان کے دفتر کے چپراسی عبدل نے سائیکل پر چھوڑنے کی پیشکش کی، جو اس نے یہ سوچ کر کہ چلو اس بہانہ عبدل کے ساتھ ذرا تعلق بناتا ہوں، قبول کر لی اور اس کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ گیا۔

عبدل کو صاحب کے گھر فائل کا بنڈل دینا تھا۔ اس لئے وہ سیکرٹریوں کے گھرانوں والی سائٹ پر جانے والی سڑک پر سائیکل چلانے لگا۔ وہ عبدل کے پیچھے بیٹھا دھیان سے دیکھنے لگا کہ اس کو یہ شہر کا حصہ جہاں سے برصغیر پر حکومت چلائی جاتی تھی، بہت خوبصورت لگا لیکن بیگانہ بھی۔ سڑکیں صاف ستھری اور درست اور سیدھی دل کو پکڑ لینے والی، رنگ برنگ کے پھول، مختلف اقسام کے گھنے درخت اور صاف ہموار اور بچھا ہوا سبزہ مگر کوئی بھی شے ایسی نہیں جس سے عام انسان کو خوف نہ آئے۔ عجب رعب تھا وہاں ہر شے پر۔ پھول تھے خوشبو نہیں۔ درخت تھے سایہ دار تھے لیکن ٹھنڈک نہیں، کتنے ہی خودرو پودے سبزہ لیکن حد سے زیادہ نفیس اور حکام والے۔

تتلیوں اور شہد کے چھتے تھے ہر دوسرے درخت اور پھول پر لیکن کوئی ڈر و رعب کے مارے رک کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جمنا کے کنارے کے ساتھ اُگا نے والی شے نئی دہلی کا یہ حصہ کہیں سے بھی تیسری دنیا کا شہر لگتا ہی نہیں تھا۔ نہ اس میں روایتی ہندوستانی تھے، نہ گند کے ڈھیر، نہ حلیم نہاری کی ریڑھی اور نہ کٹے ہوئے تربوز اور گنے کے رس بیچنے والے، نہ آوارہ آدمی اور نہ ہی اس نسل کے کتے، نہ اس کے چوکوں میں فقیر تھے نہ سڑکوں پر کھیلنے والے بچے، جنہوں نے محلّہ والوں کا جینا حرام کیا ہوتا ہے۔ راستے بھر عبدل کا مسلسل تبصرہ جاری تھا۔ اس نے دلمیر سنگھ سرکاری کو دکھایا کہ یہ ڈپٹی سیکرٹریوں کے بلاک ہیں اور یہ جوائنٹ سیکرٹری کا بلاک ہے، اس میں ڈپٹی نہ رہ سکتے تھے اور یہ مرکزی سیکرٹریوں کا بلاک ہے، جس میں جوائنٹ سیکرٹری کے پر جلتے ہیں۔ اسی طرح ڈپٹی سیکرٹری سیکشن افسروں سے نفرت کرتے تھے مطلب ہر کوئی اپنے عہدہ کے حساب سے تھا، اسی طرح چھوٹے ملازمین کی بستی اور ان کے کوارٹرز جو شہر کی دوسری طرف تھے۔

ہر ملازم سرکاری اپنی اپنی نسبت و عہدہ کے حساب سے آباد تھا۔ چھوٹے اہلکاروں کے کوارٹر کے رنگ ایک جیسے تھے اور رہنے والوں کی شخصیت اور سوچ بھی۔ اعلیٰ افسر وہاں سے گزرتے ہوئے ناک چڑھا کر گزرتے تھے۔ غرض نئی دہلی کا نام سٹی آف گریڈ یا سٹی آف درجہ بندی ہونا چاہیے تھا۔ ہر میز چائے کے کپ اور فائل کا انبار اور سپرنٹنڈنٹ اور سیکرٹری کے سائیڈ ٹیبل پر دوائی کی بوتلیں اضافی ہیں۔ عبدل کے پیچھے پیچھے وہ اس افسری کے بلاک کی سیر کرتے کرتے کناٹ پیلس کی طرف نکل آئے۔ روڈ پر آل انڈیا لیبر مورچہ کے تحت ہڑتال تھی۔ ہندوستان نے جن بڑی بڑی کمپنی کے، بے شک وہ سرکاری تھی یا نجی ملکیت میں ان کے دہلی دفاتر کی تنظیم نے وہ تنخواہ میں معمولی اضافہ چاہتے تھے۔ پھر جب نہ ہوا تو تنگ آ کر ہڑتال کر دی اور سڑک پر ایک بڑی تعداد بیٹھی تھی۔

اس ہجوم کو دیکھ دلمیر سنگھ کا دل میں نہ جانے کیا آئی۔ اس نے عبدل سے کہا کہ وہ جائے۔

وہ آج کی دوپہر بلکہ شام اور رات تک اسی جگہ ان کے ساتھ بیٹھے گا۔ مطالبہ حرف عہدہ دار چند روپیہ تنخواہ میں اضافہ کا تھا لیکن ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا میں بیٹھی بیوروکریسی تو پھر بیوروکریسی ہی تھی نا۔۔۔

دلمیر سنگھ سرکاری کافی دیر تقریریں سنتا رہا۔ ہڑتال اور سڑک بے شک دہلی کی تھی لیکن باتیں اور مسئلہ سارا کلکتہ کا تھا۔ تین بڑے مطالبات تھے ان ہڑتالیوں کے۔ تنخواہ میں اضافہ، صوبہ میں خوراک کے میزان میں کئی لاکھ ٹن کی کمی تھی اس کا کوئی حل اور پولیس گردی کا ریاست میں سے مکمل خاتمہ اور نقل مکانی والوں کی روک اور جو آ گئے ہیں ان کی بحالی لیکن یہ ضمنی تھا اور ہڑتال میں بنگالی سامعین کے لئے آل انڈیا لیبر لیڈر اپنے اپنے جوہر خطابت کو آزما اور نکھار رہے تھے۔

عام بنگالی ڈھاکہ میں بھی اور کلکتہ میں بھی یہ بات کر رہا تھا کہ نہ تو اس کی روٹی پوری ہوئی اور نہ اس کے اوپر چوکی تھانہ کی بدمعاشی تو آزادی آئی کہاں ہے؟ مگر بیوروکریسی کی لاڈومیکالے کے رولز سے آگے نہ کچھ آتا تھا اور نہ وہ سیکھنا چاہتے تھے۔

اس کی بنیادی تربیت تھی کہ اجتماعی مطالبہ خاص طور پر غریب کیسے کتنے ہی حقیقی اور ضروری کیوں نہ ہو، ان کو مسترد کر دو۔ سازشی اور جبر کے ذریعے ان کی تحریکوں اور ہڑتالوں کو ختم کرو۔ پھر مذاکرات کے بہانے دن گزارو تا کہ ان کی قوت اور عزم کمزور پڑے کیونکہ تازہ دیہاڑی والے ہوتے ہیں ان کی جان کو روٹی کی فکر ہی بہت ہے۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس آخری حربہ ہے

جس جگہ یہ ہڑتالی بیٹھے تھے اس عمارت کی چوتھی منزل میں ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا کے چیئرمین کا دفتر تھا جو سابقہ ڈپلومیٹ تھے اور سول سرونٹ تھے۔ بڑے اصول والے اور وضع دار نرم خو، تہذیب یافتہ مشہور تھے لیکن بے چارے اپنی تربیت کے ہاتھوں مجبور ہوں گے۔ سرکاری نوکری میں پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ آپ کا دل دماغ اور جذبات اور سوچ سرکار ہی کے لئے ہیں۔

مغرب کے وقت تک ہڑتالی تھکے تھکے سے اور ایک دوسرے کو لطیفے سنا سنا کر تنگ آ چکے

تھے اور خود دلمیر سنگھ بھی۔ اس کے ساتھ کسی نے اس دوران بات نہ کی اور نہ ہی اس نے۔ فوج اور سول سروس میں سکھ بہت تھے اور تعداد سے بھی زیادہ نمایاں تھے۔ فوج میں اور انتظامیہ میں نمائندگی کی وجہ سے بہت زیاد پر اعتماد بھی تھے اور اس لئے اکثر ایسے گروپ یا لسانی طبقات جو کہ زیادہ قدم نہ جما سکے تھے۔ وہ سکھوں سے تھوڑا سا فاصلہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی ایک اشرافیہ کا حصہ ہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے تمام تو اس طرح سے نہ تھے۔

دلمیر سنگھ کو خوش قسمتی سے کناٹ پیلس سے ہی ایک تانگہ مل گیا اور وہ اپنے کوارٹر چلا گیا راستہ میں اس نے اپنے لیے دال روٹی خریدی اور کوارٹر میں جا کر کھا کر سو گیا۔ اس رات کمرہ میں بہت حبس تھی اس کی رات سوتے جاگتے گزری۔

رات کو اس نے خواب آتے جاتے رہے۔ اس کو خواب میں تقسیم کے وقت کے مناظر۔ ماسٹر تارا سنگھ کی تقریر۔ ان کا کرپان ہلانا اور فسادات کا شروع ہونا۔ پھر اپنے بیٹے گھبرو سنگھ کی لاش۔ گنڈا سنگھ کے خونی راستے جہاں پر انسانوں کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کتے اور گدھ بھی تھک گئے تھے۔۔ انسانی خون کا تا حد نظر پھیلاؤ۔ وہ نیند میں جاتا تو اس کو یہ سب نظر آتا اور وہ جاگتا تو سوچتا کہ اس سب کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ملا سکھوں کو با حیثیت کمیونٹی تقسیم سے یا نام نہاد آزادی سے۔ خاص طور پر ان خاندانوں کو جن کا تقسیم میں کچھ نہ بچا۔ جن کو اپنے پیاروں کی لاشیں اُٹھانی پڑیں۔ ان خاندانوں سے اس کو زیادہ ہی ہمدردی تھی کیونکہ اس کا خاندان بھی ان میں شامل تھا۔

کتنی بڑی بڑی جاگیریں تھیں سرداروں کے پاس۔ کتنے سکھی تھے۔ سکھوں کے بالائی طبقہ میں کوئی بھی اس موضوع پر بات نہ کرتا تھا۔ ہر کوئی چندی گڑھ اور نئی دہلی میں قدم جمانا چاہتا تھا۔ اور جما رہا تھا۔ کوئی بھی ایسی بات نہ کرنا چاہتا تھا کہ جس سے اس کے حاضر مفادات پر اثر پڑ جائے۔ بظاہر لگتا بھی یہ تھا کہ وسطی ہند کے ہر شہر میں خالصہ کمیونٹی ترقی کر رہی تھی۔

پنجاب کی داخلی سیاست میں بھی بڑے گھروں کو کھلی چھٹی تھی۔ اب ظاہر ہے غریب کی تو

دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے نا۔ جو بڑے نام یا خاندان تھے۔ انہوں نے ہی فیصلے کرنے تھے اور معاملات سے فائدہ لینا تھا۔

ویسے بھی حالیہ پانی کی تقسیم کے مسلہ کے علاوہ کمیونٹی کو بڑا مسئلہ نہ تھا۔ بانی قیادت کے ساتھ ایلیٹ سکھ گھرانوں کے معاملات ہموار تھے۔ دلمیر سنگھ جیسوں کو بھی کسی دہلی میں کوارٹر اور کسی نئی دہلی کی نئی وزارت میں نوکری مل ہی جاتی تھی۔ ابھی پنجاب کی فرقہ وارانہ تقسیم، ہریانہ پنجاب کے درمیان پانی کا مسئلہ دارالحکومت چندی گڑھ کی عمارتوں پر جنگ۔ پھر دربار صاحب گولڈن ٹیمپل پر بم باری۔ بہت بعد کی باتیں تھیں۔ ابھی یہ نو آزاد شدہ انڈیا تھا۔ جس میں اعلیٰ سطح پر ایک انسان کے طور پر سوچنے والا آدمی بیٹھا تھا اور ان کے اشارہ ابرو پر کروڑوں انسانوں کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ جاتے تھے۔ لوگ اس کے منہ کی طرف دیکھتے رہتے تھے اور وہ ملک کی بنیادیں میں ایک ایک پتھر نہایت دھیان سے لگا دیتے تھے۔ کوئی نہ تھا جو ان سے ملک پالیسی کی تعمیر میں اختلاف رائے کا خیال تک دل میں نہ لاتا۔ جرات تو بہت بعد کی بات ہوتی ہے۔ ان کے ہم عصر سب کے سب اس دنیا سے جا چکے تھے۔ سوائے ایک کے۔ ویسے تو اب کسی کی موت میں سے کیا اچھا برا پہلو نکالنا۔ موت نے سب کو آنا ہے۔ برحق ہے کو جب اپنا ذہن کھل کر نافذ کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اس کا بھرپور استعمال کیا۔ صبح تک دلمیر سنگھ سوتے جاگتے ایک نتیجہ تک پہنچ چکا تھا کہ عام انسانوں کو تو کچھ نہ ملا۔ تقسیم صرف دو فریقین کے درمیان کر دی گئی۔ اس خطے میں عام انسانوں کو تو کچھ فائدہ نہ ہوا۔

خود اس کا بچہ ہائے کیسا گھبرو تھا۔ اس لئے تو اس کی ماں نے اپنے پوتا کا نام ہی گھبرو سنگھ رکھا تھا۔ اس کی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار آتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا عام انسان ابھی تک بھوک کے ہاتھوں ویسے ہی تنگ ہیں۔ جیسے تقسیم سے قبل تھے۔

تو کیا سکھوں کے ساتھ دھوکہ ہوا؟

کیا تارا سنگھ جی کی اچانک لیڈر شپ کا ظہور کیوں پلان تھا؟

کیا مہاراجہ پٹیالہ اور کشمیر کا اسلحہ کی تقسیم فسادات کی آگ لگانا کسی اور کا پلان تھا؟

کیا یہ اعلیٰ عہدہ کے لوگ سب کے سب استعمال ہو گئے؟

یا انسان کی حسد و ہوس نے یہ سب کروایا؟

یہ تو دلمیر سنگھ بھی جانتا تھا کہ انسان ایک دوسرے سے کتنی نفرت کرتے ہیں اور بلا وجہ کرتے ہیں۔تو کیا دل میں موجود نفرت تقسیم کی ذمہ داری تھی؟

کیا حسد و ہوس تقسیم کی ذمہ دار تھی؟

اس کے گھبرو سنگھ کی قاتل نفرت تھی؟

اس کے بے گھر ہونے کی وجہ ہوس تھی؟

اس نے بھوکے پیٹ نیلے آسمان تلے پرانی دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر رات گزارنے کی وجہ اس کی ذمہ دار حسد و رقابت تھی

یہ سب کیوں ہوا؟

کیسے ہوا؟

اور سب سے بڑا خوف کیا دوبارہ تو نہ ہوگا؟

☆☆☆☆☆☆☆

دُکھ کی جاگیر

(اُردو)

دنیا شاید نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ درخت ابھی تک خود ہی اُگ آتے تھے اور جنگلوں میں گائے اور چرند پرند ابھی بھی وافر تھے۔ ان کو ابھی بے وجہ مارنے کا رواج نہ شروع ہوا تھا۔ بار میں ہزار ہا جڑی بوٹیاں موجود تھیں اور اس پر اب سکوت تھا۔ چاند آج جو چودھویں کا تھا اور سارے بار میں اس کی چاندنی پھیلی تھی۔ ملک پہلوان سنگھ عرف پہلوں دھوتی باندھ کر دنیا کے سارے مسائلوں سے آزاد ہزار ہا مچھر کے باوجود گھاس پر موت جتنی گہری نیند سویا پڑا تھا۔ وہ رات کو اپنے جھونپڑے میں سے بے وجہ ہی ادھر دریا کے کنارے آیا تھا اور پھر یہاں ہی سو گیا تھا۔ ابھی بے وجہ موت بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پہلوان سنگھ عرف پہلوں صبح صادق کے وقت خود ہی اٹھ بیٹھا اور آنکھیں میچ میچ کر اپنے اردگرد دیکھنے لگا کہ آج اس کا جھونپڑا نیا نیا سا کیوں لگ رہا ہے پھر اس نے اُٹھ کر دیکھا تو اس کو یاد آیا کہ وہ رات اِدھر آ گیا تھا۔

وہ سامنے رواں دریا پر گیا اور منہ دھویا اور اس کے شفاف پانی سے ہی نہایا بھی اور پی بھی گیا۔ ابھی دریا بھی شفاف تھے کیونکہ دنیا شاید نئی نئی بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی دھوتی دوبارہ باندھی اور اپنے اوپر چادر لی اور واپس اپنی آبادی کی طرف رُخ کیا۔ اس نے جنگل میں سے کچھ جنگلی پھل ایک درخت سے توڑا اور اس کو کھا لیا۔ صبح صبح کا وقت تھا اور چرند پرند مالک کی ثناء میں مصروف تھے۔ دور کسی جگہ سے ہلکی ہلکی بانسری کی سریلی آواز آ رہی تھی۔ پہلوں وہاں ہی بیٹھ کر پھلوں اور اس سریلی آواز کو اپنے اندر اتارنے لگا۔

''موراں والی'' ایک درختوں کے پتوں اور لکڑی کے ستونوں سے بنائے ہوئے گھروں کی آبادی

تھی۔ دریا کے کنارے یہ آبادی جنگل میں کسی جگہ تھی۔ کس جگہ؟ یہ تو کسی کو بھی نہ پتہ تھا کیونکہ ان 40 گھروں میں رہنے والے 120/130 انسانوں کے پاس نقشہ نامی کوئی شے نہ تھی۔ سردار جمن اس آبادی کا سردار تھا اور وہ اس وقت صبح کے ناشتہ کے بعد اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھا تھا اور آبادی کے ساتھ موجود کھیتوں کو پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا کہ اس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصل کا حال کچھ بہت ہی خراب تھا۔ اس کے اپنے ذخیرہ میں تو کچھ غلہ موجود تھا لیکن اس کو پتہ تھا کہ اس فصل کے بعد آنے والے سال میں اس کی آبادی ''موراں والی'' کے تقریباً تمام ہی رہائشیوں کو غلہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ فکر مند تھا کہ ایسی صورت میں ان لوگوں کو مجبوراً جنگلی پھلوں اور دیگر نباتاتی ذرائع پر گزارہ کرنا پڑے گا۔

اس کو اس سارے مسئلہ کا کوئی حل نہ سمجھ آتا تھا۔ اس دوران اس نے دیکھا کہ اس کے گاؤں کا نائی اس کی طرف آ رہا ہے اور اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی ہے۔ وہ دونوں آئے اور اس کے پاس چپ کر کے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد اس کے گاؤں کے نائی نے اس کو بتایا کہ یہ دور شہر کے ساتھ ایک گاؤں سے آیا ہوا اس کا رشتہ دار ہے اور عجیب سی بات کرتا ہے کہ اس کے علاقے میں جنگل میں کوئی سرکار بھی ہے۔ جو کہ نئے لوگوں کو مٹی اور پانی سے گھر بنا کر اور جنگل کو کاٹ کر اور کچھ جگہ پر آگ لگا کر صاف کر رہی ہے۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ پانی کو بھی نالوں میں جمع کرنے اور نئے دریائی راستے اوئے کیا نام بتایا کیا بنا رہے ہیں؟ اس کے گاؤں کے نائی نے ساتھ آنے والے سے پوچھا ''نہر'' اس نے جواب میں کہا۔ ہاں جی کوئی نہر ہے سمجھو دریا کا دریا ہوا وہ بھی بہا دیئے ہیں اور تو اور زمین میں کھیت کا بھی حساب ہوا کرے گا اور پھر اُس میں سے فصل بھی محصور اور سب کو ملے گی۔ کمال یہ ہے کہ وہ دریا کبھی بھی چڑھے گا نہیں اور سارا سال چلے گا۔

سردار جمن یہ بات سن کر حیران رہ گیا کہ یہ سب کیسے ممکن ہے اگر یہ ہو گیا تو پھر تو غلہ عام ہو جائے گا

۔اس دوران اس نے دیکھا کہ ''پہلو'' بھی اس کی سمت آ رہا ہے۔اس نے پہلو کو بٹھالیا اور پھر نئے آنے والے نائی نے مزید بتایا کہ کھیت بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔لیکن نئے لوگ بھی آ گئے ہیں اور کھیت اب ہر کسی کو سرکاری حساب سے ملے گا اور پانی بھی۔بیج اور محنت کے بعد فصل میں سے حصہ دینا ہوگا اور یہ نظام اب تمام علاقوں میں آ جائے گا۔''پہلو'' اس کی بات سن کر فوراً کہا'' اوئے بوا! تو کون ہے؟ اس نے کہا'' میں عالم گڑھ کا نائی ہوں۔نام میرا دھیان ہے۔

''پہلو'' نے کہا کہ اوئے نائی ہے تو اس لئے ایسے باتیں کر رہا ہے۔ بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دریا نئے بن جائیں اور بات رہ گئی یہ کہ فصل ہو ہماری اور اس میں ہم دیں حصہ (ساتھ اونچا اونچا ہنسا) ہمارے سے حصہ لے گا کون؟ اور پھر یہ سب عالم گڑھ کی بات ہے۔یہ ''موراں والی'' تو اس سب سے بہت دور ہے اور یہ اتنی بڑی بار ہے۔اس میں بھلا کیا زمین یا کھیت میں کوئی کمی ہے یا ہو گی۔کمی ہے نہ کمی والی بات کرتا ہے نہ۔یہ کہا کہ اس نے جھونپڑے کے ساتھ پڑی کرپان اُٹھائی اور کہا کہ ''گرو دی سوں (قسم) جو آیا واپس نہ جائے گا۔''

یہ ''موراں والی'' میں ہم ہی ہم ہیں۔سرکار بھی کتنی آئی کتنی گئی۔دادی بتاتی ہے کہ کوئی اکبر بھی تھا اور وہ بھی اس بار میں آیا تھا اور ناحق لوگوں کو تنگ کرتا تھا لیکن نہ تو بار ختم ہوئی نہ ہم سے حصہ لے سکا۔ اب یہ نئے پتہ نہیں کون ہیں اور کہاں سے آئے۔لیکن ان کو یہ نہیں پتہ کہ بار کا اپنا قانون ہے اور گرو دی قسم! کرپان نال ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا تو پہلو میرا نام نہیں اور ہاں یہ فضول باتیں کسی اور کو نہ کرنا کیون لوگوں کو بلاوجہ پریشان کرتے ہو۔اس بار بارش ویسے نہیں ہوئی تو فصل کی پریشانی الگ ہے اوپر سے تو نئی نئی باتیں سے آ گیا ہے۔نائی بیچارہ اب سوچ رہا تھا کہ فضول ان سرداروں کے منہ لگا۔جب ان پر آ گئی تو ان کو پتہ چلے گا۔لیکن منہ پر تو یہ نہ کہہ سکتا تھا۔اس نے کہا کہ جی! ٹھیک ہے۔اس کے بعد سردار جمن نے نائی کو کہا کہ میراثی کو بلا کر لاؤ۔کچھ دیر میں صلو میراثی بھی آ گیا تو سردار جمن نے کہا کہ میراثی آج نہ مجھے بابا فرید کی کوئی باہندی سنا دے۔

میراثی نے کچھ دیر سوچا پھر باقاعدہ طرز سے گا کر بابا فرید صاحب کی ایک باہندی سنانا شروع کر دی۔ جب میراثی نے باہندی پڑھنی شروع کی تو سردار نے آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ جوڑ کر اسی کلام کو سنا۔

اُدھم اور جسپال دونوں پہلو کے بیٹے تھے اور اس وقت وہ دونوں اپنے مال چرانے میں مصروف تھے اور "موراں والی" سے کچھ باہر آئے تھے۔ دونوں میں بڑا اتفاق تھا۔ ادھم کہنے لگا اوئے جسپال توں گرو کی گرنتھ کا جو پات گرنتھی سے لیا تھا۔ وہ یاد کیوں نہیں کرتا۔

جسپال نے کہا کہ "بھرا! بس یاد ہوتا نہیں" اس کے بعد جامن کے درخت پر لگے جامنوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے مٹی کا ایک پتھر اُٹھا کر جامن کے گچھوے کو مارا لیکن وہ لگا نہیں وہ درخت پر چڑھنے لگا۔ اُدھم سنگھ اس کو چپ کر کے دیکھنے لگا کہ کیا کرتا ہے۔ وہ لڑکوں کی طرح آرام سے اوپر چڑھا اور اس نے جامنوں کو اتارا اور نیچے آ کر وہ دونوں کھانے لگے۔ اس دوران وہ اپنی بھینسوں کو بھی دیکھتے رہے اور موراں والی کی روزمرہ کی باتیں بھی کرتے رہے۔ ادھم نے کہا کہ یار جامن بہت اچھے ہیں۔ ذائقہ ٹھیک ہے۔ اس نے کہا "ہاں! موسم ہے سردار جی۔ درختوں پر جو بن آیا ہوا ہے نا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کندھے کے صافے میں بچھائے ہوئے جامن ڈالے اور اپنا مال کو ہانکتے ہوئے واپس ہو لیے۔ "موراں والی" کے اطراف میں کھیتوں کا حال بس ٹھیک ہی تھا۔ ان کے مال کے چلنے سے خشک اور پیاسی زمین سے دھول اُڑ رہی تھی اور وہ دونوں بھائی اس لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت اطمینان سے آرام سے اس دھول سے بعد از دوپہر کی ڈھلتی شام سے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے وہ نہایت آرام سے چلتے ہوئے اپنے گھروں کو شام پڑے واپس جا رہے تھے۔ سر شام ان کی طرح کے کچھ اور لوگ بھی "موراں والی" کی طرف بھی جا رہے تھے۔ زمین سے چند منٹ اوپر تک خشک زمین کی وجہ سے دھول اور گرد اُڑ رہی تھی۔ لیکن اس سب کا اوپر ڈھلتی دھوپ جس کا رنگ کنو کے چھلکے جیسا ہوا رہا تھا۔ وہ پڑ رہی تھی اور اس سب میں ایک اپنا ہی سحر تھا جیسا۔

صبح صبح کا وقت تھا۔نور منصور دا ویلا۔ ''موراں والی'' جس پر کوئی ابھی سویا پڑا تھا۔آرام سکون سے نیند میں تھے اور خوابوں میں گم تھے۔ جب اچانک ایک دھما کہ سا ہوا اور لوگ ڈر کر اپنے اپنے جھونپڑے سے باہر آ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چند درجن گھوڑوں پر سوار ایک دستہ موراں والی کے درمیان موجود ہے اور ان کے پاس برچھی اور بندوقیں ہیں جب سب لوگ باہر نکل آئے تو انہوں نے ڈھول نکال کر اس کی تاپ پر لکھا سا پیٹا اور بجایا اور اس کے بعد ایک شخص نے اعلان کیا کہ صاحب بہادر اسسٹنٹ کلکٹر راوی نیلی بار خان بہادر ولیم صاحب بہادر دا حکم ہے کہ ''موراں والی'' کے تمام بالغ افراد اپنے نام درج کروا کر جنگلات کی صفائی اور برتی کے لیے درخواست گزار ہو۔ مزید یہ کہ آج سے بار کا بندوبست کیا جاتا ہے۔اس لیے اب تمام رقبہ جات کھیت اور جنگلات بحق سرکار ضبط اور ملکہ وکٹوریہ کی ملکیت ہیں اور تمام افراد اور رہائشی بار ملکہ برطانیہ کی رعایا ہے۔اس لئے انڈیا ایکٹ قانون کے پابندر ہیں۔اس لئے آدھہ مربعہ فی بالغ افراد ملکہ کی حکومت کی طرف سے ہر درخواست گزار کو لگان اور نہری پانی کا معاملہ کے بدلہ میں دیا جاتا ہے۔اس کے بعد انہوں نے بندوق سے فائر کر کے سامنے درخت پر بیٹھے ہوئے چند مختلف پرندوں کو مار گرایا۔ دھمک اور پرندوں کا خون گرنے سے خواتین میں خوف و ہراس پھیل گیا۔لوگ گم سم اور سہم کر دیکھنے لگے کہ ان کا کیا کیا جائے؟

یہ اعلان کر کے وہ دستہ واپس چلا گیا اور ان کے جانے کے بعد موراں والی کے تمام بزرگ بوڑھے برگد کے نیچے جمع ہو گئے اور چپ چاپ رمضٰی مصلی نے حقہ گرم کیا اور درمیان میں لا رکھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر یونہی گزر گئی۔

موراں والی دو سب سے پرانی چیزیں ایک بابا شیر سنگھ تھا اور دوسرا یہ برگد کا درخت تھا۔

سب سے پہلے بابا شیر سنگھ بولا کہ ''اگر زمین میں سے فصل نہ ہو؟

پھر بھی لگان۔۔۔ یہ تو وہی ظلم ہوا جیسا مغل بادشاہ اکبر نے کیا تھا۔اس کے بعد پھر سوچ میں گم ہو گیا

اس کے بعد سردار نونہالہ سنگھ نے کرپان ہلائی اور کہا کہ ''حد ہوگئی ہم رات سوئے تو سردار تھے اور بار کے مالک تھے۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

صبح اُٹھے تو رعایا۔ پتہ نہیں سارے ''موراں والی'' کو ہو کیا گیا تھا۔

کوئی بولا ہی نہیں۔

نہ کوئی نام لکھوائے گا اور نہ کوئی آدھا مربعہ لے گا۔ اب جو بھی دستے آئے ان کو اسی جگہ کھیت کر دوں گا۔

قسم گرو کی۔ گل نے ہو کیا نہ گئی۔ ایسی تیسی ملکہ کی اور ولیم کی۔ نونہالہ سنگھ کی بڑھک کے بعد کچھ اور نوجوانوں نے بھی گرم دیکھی۔ فیصلہ ہوا کہ اب جو بھی آیا۔ اس کو سبق سکھا کر واپس بھیجا جائے گا۔ پہلوان سنگھ نے اپنی تلوار سمیت آکر چوپال میں حصہ لیا اور کہا کہ ''سرداروں! بات آ گئی ہے سوراج کی عزت کی اور دھرم کی۔ یہ بات صرف زمین یا گان کی نہیں۔ یہ بات آگے بڑھے گی۔ مجموعی طور پر لوگوں کے چہرے پر ڈر اور سہم تھا کہ یہ کیا بیٹھے بٹھائے نئی مصیبت آ گئی ہے۔ اس کے بعد لوگ اپنے اپنے جھونپڑوں میں تیز دھوپ سے بچانے کے لئے واپس چلے گئے۔

اگلے دن صبح صبح ہی لوگوں کی آنکھ دھواں کی بدبو سے کھلی۔ لوگوں نے باہر نکل کر دیکھا تو دور جنگل میں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جیسے جنگل میں کسی نے کوئی بڑا سا الاؤ لگایا ہو یا آگ لگی ہو۔ لیکن ان کو کچھ سمجھ نہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ نونہالہ سنگھ اور چار مزید نوجوان گھوڑوں پر اس سمت گئے جہاں سے دھواں نکل رہا تھا۔ نونہالہ سنگھ کی گھوڑی کا نام رانی تھا۔ نونہالہ رانی پر بیٹھا تھا۔ نونہالہ کے ساتھ اس کے سنگتی بھی تھے۔ نونہالہ سنگھ نے پگڑی باندھی ہوئی تھی اور اس کے کمر کے ساتھ تلوار بندھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں کڑا اور کریاں تھی۔ نونہالہ سنگھ اس شان سے نکلا کہ جیسے کوئی خالصہ جنگ پر جا رہا ہوتا ہے۔ بوڑھی مائی گرداس کور نے دیکھا کہ گرو دی شان نونہالہ آج تجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ نونہالہ سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا مائی گرو دی رکھاں ہوان۔ مجھے کیا نظر لگنی ہے۔ بس آج مجھے

کوئی بندوبستی مل جائے تا کہ کلیجہ میں ٹھنڈ پڑ جائے۔ یہاں ہمارے بار میں ہماری پنڈ میں آ کر بندوقیاں چلتے ہیں۔ان کو سبق نہ سیکھو تو مجھے زندگی کا کیا فائدہ ۔۔۔ یہ کہہ کر خالصہ کی جے کا نعرہ لگا کر نونہالہ سنگھ وہاں سے گھوڑے کو بھاگتا ہوا نکال گیا۔

اسسٹنٹ کلکٹر صاحب بہادر موقع پر خود جنگل کو آگ لگوا دیئے تھے۔ ولیم صاحب انگلستان سے حال ہی میں ہندوستان آئے تھے۔انہوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ یہ وہ ہی ولیم تھا جو کہ لنکا شائر کی گلیوں میں سرد راتوں میں شاعری کرتا تھا۔ جو کہ لنکا شائر میں ایک درخت کے کاٹنے پر اجتماعی مظاہرہ میں شامل ہوا تھا اور اس کی محبت میں پتہ نہیں کتنے دن رویا بھی تھا۔آج وہ ہی ولیم پورے جنگل کو خود آگ لگا رہا تھا۔

کیا اک روٹی انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے؟

کیا ICS افسر ہونے سے آدمی مکمل کا مکمل بدل جاتا ہے؟

کیا انسان کو صرف وہ ماحول یا زمیں ہی پیاری ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہو؟

ویسا یہ بھی سمجھ نہ آئی کہ انسان کسی زمین سے کیسے جوڑتا ہے؟

کیسے وابستہ ہوتا ہے؟

اس آدمی کی آنکھوں میں لنکا شائر کے ایک درخت کے لئے آنسو تھے اور یہاں پہ ہزاروں لاکھوں درختوں کو آگ لگوا رہا ہے۔اس لمحہ بھی اس کی آنکھوں سے پانی رواں تھا لیکن یہ دھواں کی وجہ سے کسی دکھ یا وابستگی کے آنسو نہ تھے۔

وہی خستہ ولیم جو کہ لنکا شائر کی سرد راتوں میں گلیوں میں آوارہ کتنی ہی راتیں کھلے میں سویا تھا۔

اب ولیم صاحب بہادر بن کر ICS افسر بن کر برصغیر برطانوی نوآبادی میں پہنچ چکا تھا۔ وہ اب اصول اور نظریہ کی نہیں بلکہ برطانیہ کے کسی دور دراز کاؤنٹی مین کسی حویلی کی ملکیت کا خواہاں ہوتا۔

نونہالہ سنگھ جنگل میں دھواں کی سمت اندھا دھند گھوڑا دھوڑائے جا رہا تھا۔اس کے ساتھ اس کے یار

سنگی بھی تھے۔ جنگل میں اس نے دیکھا کہ ایک سادھو بھی پھرتا ہے۔ اس نے گھوڑا روکا اور سادھو سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

یہ آگ کیوں لگی ہوئی ہے۔

سادھو نے بتایا کہ وہ معمول کے مطابق آنکھیں بند کر کے جنگل میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کو یہ دھواں نظر آیا۔

اس نے جا کر دیکھا تو لال وردی والے سپاہی اور ان کے ساتھ ایک داروغہ گلابی اور سفید رنگ والا صاحب جنگل میں مختلف جگہوں پر آگ لگا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ ظلم کر رہے ہیں۔

نونہالہ سنگھ نے کہا کہ کوئی نہیں باوا جی! میں ان کو سمیٹ لیتا ہوں۔ اس کے بعد نونہالہ دوبارہ دھواں کی طرف تیزی سے نکل گیا۔ اس دوران اس کے سنگی میں سے ایک گھوڑے کو ٹھوکر لگی۔ لیکن نونہالہ آگے تھا۔ اس کو پتہ نہ چلا اور وہ دھواں کی طرف ہی گیا۔ باقی لوگ بھی اس گھوڑے کی وجہ سے رک گئے۔ آگے دھواں کے پاس ہی ولیم جنگل کے سحر میں گم اکیلا کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک فلمی سین جیسا سکھ آ رہا ہے۔ نونہالہ نے گھوڑے سے ہی کرپان ولیم کے سینے میں اتار دی اور ولیم کی چیخ سن کر اس کے سپاہیوں نے نوہالہ کو فائر مار کر گرا دیا۔ جب تک سپاہی پاس آئے۔ ولیم اور نونہالہ دونوں مر چکے تھے۔ اِسی دوران نونہالہ کے سنگی بھی وہاں آئے۔ مقامی سپاہیوں نے نونہالہ کی لاش کمال مہربانی کرتے ہوئے اس کے سنگیوں کو دے دی۔

☆☆☆☆☆☆☆

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

اِک تماشا

(اُردو ناولٹ)

وہ دوپہر بھی ایک روز آنے والی دوپہر جیسی دوپہر ہی تھی۔ جب شاہنواز عابد اپنی چھوٹی سی کورے چلاتا ہوا ڈیفنس میں واقع اپنی یونی ورسٹی سے واپس اپنے گھر آیا۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ اس کے سکول کے لڑکے اور لڑکیاں اسی طرح مختلف اسباق کی تیاری کر رہے تھے اور کراچی میں ویسا ہی حبس تھا۔ جیسا کہ ازلوں سے ہر ساحلی شہر میں زوال پذیر گرمیوں میں ہوتا ہے۔ شاہنواز عابد ''ویلی سکول آف فلمز اینڈ لبرل اسٹیڈیز'' میں فلم وتھیٹر کا طالب علم تھا۔ اس کا باپ ایک بڑی ملٹی نیشنل میں درمیانہ درجہ کا ملازم تھا اور کافی اچھی تنخواہ پاتا تھا۔ وہ بالائی متوسط طبقہ کی آبادی ''سی ویو ٹاؤن'' میں اپنے 300 گز کے گھر میں مقیم تھا۔ اور اپنی زندگی سے بہت خوش تھا۔ اس کی مجموعی فیملی ایک عدد والد، والدہ اور بہن پر مشتمل تھی۔ وہ سندھ کی اولڈن اقوام میں سے ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی نانی جو کہ چند سال قبل فوت ہوگئی۔ اس کو بتایا کرتی تھی کہ وہ لوگ راجہ کے زمانے سے اسی دھرتی کے باسی ہیں اور انہوں نے اس محدود مدت کے علاوہ جب راجا کی حکومت ختم ہوئی تو اس خطہ میں نیا بادشاہ آیا اور پھر واپس بھی چلا گیا۔ اس محدود مدت کے علاوہ کبھی بھی اس دھرتی سے اپنا ناتا نہ توڑا۔ اس کی بہن نے آثار قدیمہ کی ڈگری ابھی حال ہی میں انڈس یونیورسٹی سے مکمل کی تھی۔ عام طور پر جیسا کہ خواتین کی عادت ہوتی ہے (اکثر کی) وہ چیزوں کو زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہیں۔ اسی طرح اس کی بہن ماروی نے بھی آثار قدیمہ کی تعلیم کو کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے لیا تھا۔ ماروی کو ابتدائی طور پر کچھ خاص دلچسپی نہ تھی اس مضمون سے وہ سولجر بازار میں ایک روایتی کانونٹ سکول سے پڑھی تھی۔ جہاں اس کی دوستوں کا حلقہ اسماعیلی / جین / پارسی / بوہرہ پر مشتمل تھا۔ یہ تمام

کمیونٹی ایسی تھی جو کہ نہایت امن پسند اور اچھے اور اپنی زندگی میں راضی اور اپنے اماموں/رہبروں کے حکموں کو ماننے والے۔ اور معاشرہ کا فعال اور پیداواری حوالے سے اچھا طبقہ۔ ماروی خاص طور پر اپنی ایک پارسی سہیلی کے ساتھ دوستی تھی۔ غرض ماروی کا رجحان اور طبیعت بھی دھیما اور خوشگوار بچوں جیسا تھا۔ وہ لبرل آرٹ اسٹڈیز میں دلچسپی رکھتی تھی۔ لیکن آثار قدیمہ کی طرف اتفاق سے ہی آ گئی تھی۔ اس کی سہیلی ''ماریہ'' بھی اپنی قدیم بنیادوں کی تلاش اور اس کی سنگت و محبت کی سہولت کی وجہ سے اسی ڈگری میں داخل ہوگئی تھی۔ دونوں کا وقت ایک دوسرے کے ساتھ سکول میں بہت اچھا گزرا۔ دونوں نے زندگی اور جدید اور قدیم کو جانتے اور سمجھتے ہوئے چار سال بہت سکون سے گزارے۔ دونوں کی ماؤں نے (ماں کی جمع) دونوں کو قدیم کرشماتی تہذیبوں کے عشق میں پہلے دن سے ہی متعارف کروانا شروع کیا تھا۔ دونوں اپنے قدیم شاندار ماضی کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی حقیقی طالب تھیں۔ اس لئے دونوں کو اس تعلیم نے اور اس وقت نے ایک خاص لطف دیا۔ وہ پہروں ایک دوسروں کو اپنی اپنی نانی اور اماں سے سنائی ہوئی۔ اپنے راجاوں اپنے داود پوتوں اور اپنے اپنے جمشیدوں کے واقعات سناتی تھی۔ اور دونوں ایک دوسرے کے واقعات نہایت دلچسپی سے سنتے تھے۔ ۔ اب جناب نقطہ یہ ہے کہ سچائی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جو موقع پر ہوئی ہے۔ دوسری وہ جو کہ روزمرہ کی داستانوں میں زبان عام پر ہے۔ برصغیر کی قدیم اور درمیانی مدت کی تاریخ کو جن المیوں سے گزرنا پڑا ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر جنگ میں ہر فریق کے باقیات کا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہی فتح پانے والے تھے۔ ہاں کچھ جنگیں ایسی ضرور تھیں جن میں کوئی حتمی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ہر ایک میں تو یہ نہیں ہوا نا۔ اک تماشا بنا دیا ہے تاریخ کو ہم نے بھی نا۔ جس کا جو دل کرتا ہے اور جو منہ میں آتا ہے۔ وہ بول دیتا ہے اور وہ ایک موقف بن جاتا ہے۔ ''موقف'' یہ بھی عجب اصلاح ہے۔ موقف کے بعد نیا لطیفہ ''نئی تحقیق''۔ ''تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ'' اب ہر دس بیس برس بعد نئی تحقیق آ رہی ہے۔ یورپ کے کچھ ممالک کے کچھ تعلیمی اداروں نے

یونیورسٹی کی سطح پر یہ قانونی طور پر allow ہو گیا ہے کہ کسی بھی تاریخی معاملہ پر سابقہ حقیقی موقف سے ہٹ کر اگر آپ نے کوئی so called ریسرچ کر لی ہے تو وہ ٹھیک ہے۔ اس کو بھی ایک موقف کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس پر research based ڈگری دے دی جائے گی۔ ابھی حال ہی میں امریکہ میں دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کہلائی جانے والی یونیورسٹی نے سکندر اعظم کی برصغیر میں آمد اور جنگ کی قدیم کہانی کو یکسر بدل کر ''نئی تحقیق'' آنے کا اعلان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ سکندر اعظم بالائی پنجاب میں بار رہا تھا، اس لئے ہی اس نے مقامی راجہ سے اس کی شرائط پر صلح کی۔ تو یہ ''اک تماشا'' کی سی صورتحال تاریخ کے ساتھ بنائی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے احساس محرومی کو تاریخ میں پیوند لگا کر رفو کرنا چاہ رہا ہے۔ لیکن وہ بقول شاعر ''بہت کام تیری دل میں رفو کا نکالا'' شاہنواز نے کورے میں ہلکی آواز میں امریکی سنگرز کے گانے لگائے ہوئے تھے اور یہ سوچتا ہوا گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں کلفٹن سے "Pizza Hut" سے پیزا ر کھاؤں یا گھر جا کر والدہ کے کا ہاتھ پکا ہوا گھر کا سالن۔ پھر سوچتے سوچتے اس نے سوچا کہ ویک اینڈ پر پارٹی ہے اس کے لیے کچھ اضافی اخراجات ہونے ہیں۔ اس لئے آج گھر سے ہی کچھ کھاتے ہیں۔ ویسے گھر کے کھانے بھی اتنے بُرے نہیں ہوتے۔ پھر اس کو ذرا سا دکھ بھی ہوا کہ اس کے ''پاپا'' اس کو اتنی کم pocket money کیوں دیتے ہیں۔ لیکن پھر خود ہی سوچا کہ ''پاپا'' بیچارے کو صرف ڈیڑھ لاکھ ہی تو ملتا ہے۔ وہ بھی کیا کیا کریں۔ اس نے سب کو ذہن سے جھٹک کر Music کو ذرا اونچا کیا اور اس کے ساتھ کار کی speed کو بھی اور سڑکوں پر رواں دواں ''اک تماشا'' دیکھتے ہوئے اور امریکی گانے سنتے ہوئے گھر کی طرف جانے لگا۔ اور پھر گھر کے گیٹ پر پہنچ بھی گیا۔

کراچی کی حبس بھری دوپہر میں گھر میں دم گھٹتا تھا۔ فاطمہ بی بی نے صرف بچہ کے خیال سے اس دوپہر میں اٹھی اور تازہ روٹی پکائی اور اب اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کبھی بھی پیچھے سے رابطہ نہ کرتی تھی۔ وہ قدیم سندھی گھرانے سے تھی۔ جس میں اب بھی شکون اور وہم بادرجہ اتم موجود تھے۔ وہ

خاندانی طور پر نہایت شائستہ، مہذب اور وضع دار تھی۔ جن کا مسلک صرف پیار تھا۔ جو بنائی ہی صرف خاوند اور بچوں کی خدمت کے لئے تھی۔ ایسی ہی ان کی والدہ تھی۔ جو کہ ان کے والد کی ہر وقت جی حضوری میں رہتی تھی اور ہر لمحہ ان کے چہرہ کی طرف تکتی کہ کیا حکم ہو اور وہ تعمیل کر دیں۔ ایسی ہی تھی۔ وہ شروع سے آخر تک۔ ان کے ابا کی ٹھٹھہ میں کریانہ کی دکان تھی۔ وہ روز صبح سویرے خود جا کر تالا کھولتے تھے اور پھر نوکر صفائی کرتا تھا۔ ان کا معمول ویسے کا ویسا تھا۔ اسی کے ابا اکثر کہا کرتے تھے کہ بھائی ہمارا مسلک تو پہلے بھی مٹی سے اور مٹی کے بندوں سے عشق کرنا ہی تھا۔ اور اب بھی۔ ہم تو پہلے بھی قلندر کے چراغ جلتے تھے اور اب بھی،۔ اسی طرح انسانیت کے پیروکاروں کی اولاد تھی فاطمہ۔

ان کو یاد ہے عابد اور وہ جب شروع میں کراچی آئے تو کیسا تنگدستی کا دور تھا۔ لیکن وہ ہر روز فقیر کی روٹی باقاعدگی سے دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ زندگی مہربان ہوتی گئی۔ اور عابد صاحب نوکری میں چل نکلے۔ شروع شروع میں ان کو محسوس ہوتا تھا کہ ان کے خاندان کو سندھی ہونے کی وجہ سے اردو بولنے والے لوگ شائد موقع نہیں دے رہے۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ وہم ہی تھا۔ یہ حقیقت بھی تو وہ ہر حال نوکری میں چل نکالے۔ اس دوران ان کی نظر گھڑی کی طرف گئی 3 1/2 بجے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب تک شاہنواز کو آ جانا چاہیے آیا کیوں نہیں۔ اسی دوران شاہنواز کی کار کا ہلکا سا ہارن آیا۔ ہارن سن کر وہ فوراً گھر کے دروازے کی طرف گئی اور دروازہ کھولا۔ اور نہایت نرم اور شفیق مسکراہٹ سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ یہ بھی ان کے خاندان میں روایت تھی۔ اسی طرح اس کی والدہ ٹھٹھہ میں اس کے بھائی اور والد کو دروازے پر ہی دیکھا کرتی تھی۔ شاہنواز نے کار سے نکلتے ہوئے دیکھا کہ اس کی والدہ حسب روایت دروازہ میں کھڑی ہیں۔ وہ اس کو ملا اور چپ کر کے آ کر چھوٹی سی کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔ اور فوراً سے پہلے اس کی والدہ نے نہایت نفاست سے کھانا چن دیا۔ کھانا دو قسم کے سالن پر مشتمل تھا۔ شاہنواز نے نہایت توجہ سے اور دھیان سے

کھانا کھایا۔ اس کو شروع سے تربیت تھی جو کہ اب عادت بن چکی تھی کہ وہ کھانا گھر سے ہی کھاتا۔ شروع میں وہ سولجر بازار کے ساتھ کے کچی آبادی قسم کے علاقہ میں رہتے تھے۔ اس وقت اس کے سکول اور اطراف میں اچھا اور صاف ستھرا قسم کا کوئی بھی ہوٹل نہ تھا۔ وہ خود بھی ترجیح دیتا تھا کہ وہ گھر جا کر ہی کھانا کھائے لیکن اب جب کہ وہ ایک اعلیٰ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اور اس کے سکول کا کیفے بھی اعلیٰ معیار کا تھا اور اس کا دل بھی کرتا تھا کہ اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ وہ وہیں پر کھانا کھائے لیکن عادت قدیم یا احترام والدہ یا کبھی کسی وجہ سے وہ گھر آ کر کھانا کھاتا تھا۔ اس کی والدہ اب تک بھی روایتی دالیں اور سبزی ہی پکاتی تھی۔ زیادہ تر گوشت سے اس کی والدہ خاص طور پر اور والد عام طور پر احتیاط ہی کرتے تھے۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب اس کیو الدین نے کبھی نہ دیا۔ لیکن شاہنواز کو چکن برگر اور تندوری چکن خاص طور پر پسند تھا۔ لیکن وہ گھر پر یہ چیز نہ کھاتا تھا۔ کیوں؟ یہ ایک اور کیوں تھا۔ جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کو کامل یقین تھا کہ اس کی والدہ اونچا بول ہی نہیں سکتیں اس کو کامل یقین تھا کہ اس کے والدہ کبھی اس کے ساتھ غصہ نہیں کر سکتے اس کے گھر کی فضا میں نہایت احترام، دھیما پن اور ٹھہراؤ تھا۔ اور اس غیر تحریر شدہ سماجی فضا کا سب سے نہایت دھیان کرتے تھے۔ اور ہمیشہ سے یہ قائم تھا۔ ہر کسی کو لگتا تھا کہ ان کے گھر کا ڈھانچہ اس فضا کی وجہ سے ہی قائم ہے اور اس کا احترام ان کے لاشعور کی تہہ میں اتر چکا تھا۔ اور وہ اس پر ایک جبلت کی طرح عمل پیرا تھے۔ اور اس کا کریڈٹ ان کی والدہ کو ملتا تھا۔ اک عجب سا آزاد اور اخلاقی طور پر مثالی تربیت کی تھی۔ اس خاتون نے دونوں بچوں کی۔ آزادی بھی دی لیکن ساتھ ان کو یہ بھی سمجھا دیا کہ احترام و معاشرتی نظم و ذمہ داری کیا ہے اور کس چیز کا نام ہے۔ دونوں بچوں نے غیر روایتی مضامین میں ڈگری کا انتخاب کیا۔ لیکن اعلیٰ نمبر لئے اور اعلیٰ سکولز میں گئے۔ ماروی نے اپنی ڈگری کے آخری سال میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ شاہنواز کے سکول کا یہ آخری سال تھا۔ ایک اور بات اور کمال کی۔ وہ یہ کہ گھر کے تمام افراد گھر میں آپس میں دھیمی اور ہلکی آواز میں بات کرتے تھے

اور بہن بھائی کے علاوہ کوئی بھی غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا۔میاں بیوی بھی کبھی کبھی ایک آدھا ہی جملہ غیر ضروری بولتے تھے۔ورنہ ضروری اور دھیمی سی گفتگو اور بس۔اک عجب سا دھیما پن تھا گھر کی فضا میں عجب سا سکون تھا یا عجب سا سکوت تھا۔پتہ نہیں کیا تھا۔فاطمہ بی بی اکثر کہا کرتی تھی کہ گھر ایک مقدس جگہ ہے اور اس کا احترام بھی ویسا ہی تھا کمال کا نظم وضبط تھا۔پورے گھرانے میں۔ہر کوئی اپنا اپنا کام نہایت ذمہ داری سے کر رہا تھا۔

حسب روایت جو کہ اب حسب عادت بھی ہو چکی تھی۔شاہنواز نے ایک سالن دو دفعہ اور ایک سالن ایک دفعہ لیا اور کھانا نہایت نفاست سے کھایا اور مجال ہے کہ ایک ذرہ بھی نیچے گرا ہوا یا بچا ہوا۔اس نے کھانے کے دوران دیکھا کہ اس کا فون نے beep کیا لیکن وہ کھانے کی طرف متوجہ رہا اور کھانا مکمل کیا۔کھانے کے بعد ان نے نہایت توجہ سے برتن سمیٹے اور ان کو کچن میں مخصوص حصہ میں رکھا اور اوپر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔اس نے اپنے ساتھ والے کمرہ میں دیکھا کہ ماروی ہے یا نہیں۔لیکن اس کا کمرہ خالی تھا۔وہ آج کل اکثر دوپہر میں اپنی سہیلی کی طرف کلفٹن چلی جاتی تھی۔

آج کل شاہنواز کا فلم اور تھیٹر کی ڈگری کے چار سالوں کے آخری ماہ چل رہے تھے آج کے ان کے پروڈیکشن کے ٹیچر سر شکیل نے کہا تھا۔وہ کلاس کے طلبہ کے ایک گروپ کو ڈرامہ کے سیٹ پر لائے گئے اور وہاں پر جا کر طلبہ کو عملی تجربہ ہوگا کہ فلم یا ڈرامہ کی ریکارڈنگ کیسے ہوتی ہے اور کیمرہ کی بنیادی عمل تکنیک کسی چڑیا کا نام ہے۔اس لئے اشد ضرورت ہے کہ وہ کسی ڈرامہ کی ریکارڈنگ کا عملی مظاہرہ بقلم خود ایک سے زائد دفعہ دیکھ لیں۔اس لئے وہ آج صبح ٹھیک نو بجے سکول پہنچ چکا تھا۔ اور ابھی تک صرف دو مزید لوگ آئے تھے اور سر خود بھی ابھی تک نہ آئے تھے۔بہر حال وہ معمولاً چپ کر کے انتظار کرنے لگا کہ سر آئیں اور ڈیفنس میں واقع ڈرامہ سنٹر کی طرف روانہ ہو۔قریب دس بجے کے لگ بھگ باقی 5 طلبہ بھی آگئے۔اور پھر بعد از انتظار سر شکیل صاحب بھی۔انہوں نے

آتے ہی تمام 7 طلبہ وطالبات کوایک نظر دیکھا اور کہا ''ویری گڈ'' اور کہا کہ ''آؤ، سب اس وین میں بیٹھو'' اور پھر وہ لوگ قریب دس منٹ کی drive کے بعد Roctt پر پہنچے۔

تمام لوگ سیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ پروڈیوسر راشد صاحب اپنے شاٹس کے نوٹس لکھ رہا تھا۔ ہیڈ کیمرہ مین جوزف ساؤنڈ ریکارڈنگ کی مشینوں کی صفائی کر رہا تھا۔ سیٹ ابھی لگایا جا رہا تھا۔ راشد نے جوزف کو ویلی سکول کی فلم کی کلاس کے بچے آج ریکارڈنگ دیکھنے آ رہے تھے۔ اسی دوران اداکار سلمان اور اداکارہ شانی بھی آئی۔ اور وہ اپنے ڈائیلاگ لے کر پڑھنے لگے۔ پیٹر کیمرہ مین نے کیمرہ کا لینز دوبارہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ پیٹر پہلے صفائی والا تھا۔ اب ترقی کر کے کیمرہ مین بن گیا تھا۔ لیکن اپنی عادت کی وجہ سے ہر شے کی صفائی ہی کرتا رہتا تھا۔ سلمان کو اداکار پتہ نہیں کس نے بنا دیا تھا۔ لمبے قد کا سوجی پھوٹی آنکھوں اور بڑھی سوٹی ذرا بھی والا یہ درمیانی عمر کا آدمی ناکام عشق حاضر نشئی زیادہ لگتا نہ کہ کسی ڈرامہ کا ہیرو لیکن راشد صاحب نے سین کی demand کے مطابق ہی اس کو یہ getup بنانے کا کہا تھا۔ آج کا سین گھر میں میاں بیوی کی لڑائی کا سین تھا۔ جس میں میاں کے عادات بد میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بیگم اس کے ساتھ لڑائی ہے۔ ویسے جہاں بیچارے میاں نیک اور شریف ہوتے ہیں۔ بیگمات وہاں بھی میں سے لڑتی ہی رہتی ہیں۔ اور ثابت ہوا کہ بیگمات کے لڑنے کا میاں کے کامیاب یا ناکام ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں بعض خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی شادی کسی بندے کی بچی سے ہوتی ہے۔ وہ علیحدہ قصہ ہے۔ سلمان مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ وہ ویلی سکول والے کہاں رہ گئے۔ اس نے آج بعد دوپہر اک پارٹی میں جانا تھا۔ اور اس کے لیے پہلے موڈ پھر تیار بھی ہونا تھا۔ جی! اچھی محفل کے لیے پہلے موڈ بنانا بھی اشد ضروری ہوتا ہے۔ اور ہاں تھوڑا بہت تیار ہونا بھی۔ اس دوران باہر کہیں دور سے لمبا ہارن سنائی دیا۔ اور قد آدم کھڑکی کے شیشہ میں سکول کی وین نظر آئی۔ تھوڑی دیر بعد جب کاریں آ گئیں تو ڈرامہ کی ریکارڈنگ شروع ہوئی۔ وہی روزمرہ کی ریکارڈنگ

ہوتی رہی۔ پروڈیوسر صاحب صرف مہارت دیکھنے کے لیے ہر 5 منٹ بعد cut cut کہتے اور بہترین قسم کی ریکارڈنگ کے باوجود shorts کو دوبارہ ریکارڈ کرواتے قصہ گو نہ کوئی 1 گھنٹہ یہ سب چلا۔ سلمان کے چہرہ کی بیزاری چھپتے نہیں چھپتی تھی اور اداکارہ بیچاری کا بھی موڈ حلیہ اور حالت زار خراب ہو چکی تھی ۔ اس کے بعد راشد صاحب نے تمام کلاس کو کوئی دس منٹ کے قریب ریکارڈنگ کی بنیادی باتیں بتائیں اور اس کے بعد کوکا کولا پیش ہوا۔ اور کے اس بعد پیٹر نے تمام کلاس کو اسٹوڈیو کا دورہ بھی کروایا۔ یہ سنٹر 1200 گز کے رقبہ پر بنا ہوا مکان تھا۔ جس میں 5 اعلی کمرے، 2 درمیانے کمرے پول ہیلتھ سنٹر ہر وہ چیز جس کی کسی ڈرامہ میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ اس مکان میں موجود تھی۔ پیٹر نے ہر وہ خوبی جو دنیا میں کسی بھی اسٹوڈیو میں ہو سکتی ہے۔ وہ اس اسٹوڈیو میں بے شک نہ تھی لیکن گنوا ضرور دی۔ پیٹر میں نچلے سماجی معاشی طبقہ کے لوگوں والے تمام مسائل تھے۔ پیٹر اب شائد اس طبقہ سے کچھ اوپر آ گیا تھا۔ لیکن اس کی عادات اور طرز گفتگو اس کے طبقہ کی چغلی کھاتا تھا۔ بہر حال یہ سب دیکھ کر اور study ٹور کر کے وہ لوگ واپس وین میں آ بیٹھے اور کچھ دیر میں واپس سکول پہنچے۔ سکول میں اس کو سر شکیل نے یہ بتایا کہ امریکہ میں فلم کی تربیت کے scholarship آئے ہوئے ہیں۔ جن بچوں کو دلچسپی ہے وہ دوپہر میں رجسٹرار کے دفتر سے فارم لے کر پر کر کے 3 دن میں واپس جمع کروائیں۔ اور اس کے بعد وہ لوگ اپنے کلاس ٹیچر کو ملنے کے لیے سٹاف روم گئے۔ ان کی کلاس ٹیچر میڈم شازیہ تھی۔ وہ ان کو سٹاف روم میں مل گئی۔ کورس ورک کی تفصیلات ہر کسی نے اپنے اپنے حساب سے discuss کی۔ شاہنواز اور اس کے دوست شہزاد انور کو میڈم نے کہا کہ آپ لوگوں نے مل کر ایک theme based فلم بنانی ہے۔ 25 منٹ دورانیہ کی۔ جس میں کچھ نیا اور اچھوتا سا theme ہو اور وہ ہی آپ لوگوں کا Thesis ہوگا۔ اور پھر سب وہاں سے اپنے اپنے مسکن کی جانب چلے گئے۔

ماریہ ماروی کے گھر آئی ہوئی تھی ۔ جب شاہنواز گھر پہنچا۔ ان کے گھر میں وہی ٹھہرا ہوا

اور محفوظ سکون تھا۔ فضا میں ایک قسم کی شائستگی اور وضع داری اور نستعلیق سا احساس۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک سکون سا سراتا پا احساس میں اتر جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح باادب پر اعتماد پر سکون گھر میں داخل ہوا۔ اور وہاں sitting میں بیٹھ کر scholarship کے فارم پر کرنے لگا۔ چند منٹ میں اس کے اسی کام پر لگے۔ پھر اس نے دیکھا کہ میز پر کچھ کھانے کا سامان پڑا ہے اس سے محظوظ ہوا اور پھر وہاں ہی بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب thesis پروجیکٹ کا کیا کیا جائے؟؟؟؟ کون سا theme ٹھیک رہے گا۔ اس کے Back of mind میں تھا کہ وہ کراچی شہر کے ہی کسی موضوع کو theme کے طور پر لے اور اس پر ہی فلم بنالے۔ کراچی شہر میں فلم بنانے میں شائد آرام اور سہولت ہی واحد وجہ تھی جو پیشِ نظر تھی۔ وہ اب اسی پر غور کر رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس دوران اس نے دیکھا کہ اس کی بڑی بہن اور اس کی سہیلی سیڑھی اتر رہی ہیں۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور وہ چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی بہن ماروی واپس آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی وہ ماریہ نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں اندرون سندھ کا visit کرنا چاہ رہی ہے۔ اور میں نے اس کے ساتھ جانا ہے اور میں چاہ رہی تھی آپ بھی ساتھ چلو۔ شاہنواز عابد بولا: میں۔۔۔۔ لیکن باجی میں نے تو اپنے thesis کا کام کرنا ہے۔ میں کیسے چلا جاؤں؟ اور آپ کا کتنے دن کا پروگرام ہے؟ پتہ نہیں میں کیا کرو اس سب میں؟ ماروی کے چہرہ پر ہلکی سی پریشانی آ گئی اور بولی: اوہ اچھا! آپ نے کوئی تحریری Assignment جمع کروانی ہے یا کوئی Documentary Video بنانی ہے۔ شاہنواز بولا: باجی! Theme Based فلم بنانی ہے کوئی 10-15 منٹ کی۔ جس میں کوئی unique سا message ہو اور اچھی بھی ہو۔ یہ سن کر ماروی بھی سوچ میں کھو گئی اور آہستہ آہستہ دہرانے لگی۔ اچھی بھی ہو اور theme based بھی ہو اور ظاہری سی بات ہے۔ idea نیا بھی ہو۔۔ ٹھیک اور پھر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں شاہنواز عابد اور ماروی عابد بھی۔ کبھی کبھی ہلکی سی پرسوچ آواز آتی ہاں میں۔

پھر تھوڑی دیر بعد میں شاہنواز نے پوچھا کہ "پھر ہم نے کب جانا ہے؟ اندرون سندھ" ماروی نے "ہم" سن کر مسکرائی اور کہا: 3 دن بعد اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اور شاہنواز عابد سوچوں میں گم وہیں سو گیا۔

آج کل ڈگری کے آخری دن ہونے کی وجہ سے شاہنواز کی کلاس کے طلبہ سکول کم کم ہی آتے تھے شاہنواز بھی آج صرف اپنی سابقہ حاضری پوری کرنے اور فیس کا چالان لینے اور جنرل ٹور پر آیا تھا۔ موسم بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اسکی عادت تھی کہ وہ سکول میں ہمیشہ نوٹس بورڈ پر ہر چیز کو غور سے پڑھتا تھا۔ کیونکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا تھا کہ باخبر ہونے کے ایک سے زائد قسم کے فوائد ہیں اور آج کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کو پتہ چلا کہ امریکی وظیفہ برائے فلم کورسز کے درخواست جمع کروانے کا آج آخری دن ہے۔ اس نے فوراً سے اپنی کلاس روم کی طرف گیا کہ وہاں سے دیکھے کہ کیا صورتحال ہے۔ کلاس میں اس کی ملاقات ابراہام پریم سے ہوئی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اور باقی عوام کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ ہم تو یہاں آیا ہے اور کوئی بھی نہیں ہے۔ پریم کونا جانے کیا مسئلہ تھا۔ ہر وقت روتا رہتا تھا۔ اور اس کی ہر چیز بھی منفی نظر آتی تھی۔ شاہنواز عابد نے سوچا کہ اس کو چھوڑ کر ایڈمن آفس میں کسی سے رابطہ کرتا ہے۔ وہ ایڈمن آفس میں راہول صاحب ایڈمن آفیسر بیٹھے تھے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ وظیفہ کے فارم کہاں سے ملیں گے سر جی۔ انہوں نے چپ کر کے گہری نظر سے دیکھا اور ایک پرچہ اس کو اٹھا کر دے دیا۔ اور کہا اسکو پُر کر کے اپنے کلاس ٹیچر کے دستخط کرواؤ اور اس کو e-mail کر دو۔ اور دوبارہ اپنے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گئے اس نے وہاں پر ہی بیٹھ کر اس فارم کو fill کیا اور اس کے بعد سٹاف روم کی طرف چلا گیا۔ وہاں پر اتفاق سے اس کو اس کے کلاس ٹیچر مل گئے ان سے دستخط کروا کر اس نے کیفے سے اس فارم کو email کر دیا۔ اس کے بعد وہ فنانس آفس گیا اور فوراً ہی اس کو فیس کا چالان بنا کر دیا گیا۔ اس کے سکول میں یہ خوبی تھی کہ دفتر کام اگر پالیسی امور سے متصادم نہ ہو تو وہ فوراً کر دیا جاتا تھا لیکن

عملہ کے رویہ میں ایک عجیب سے پتہ نہیں کیا تھی؟؟

رات کے کھانے کے بعد شاہنواز اور ماروی اور ان کے والدین بیٹھے روزمرہ کے امور پر باتیں کرر ہے تھے اور آج کا اہم ترین ایجنڈہ یہ تھا کہ صبح دونوں بہن بھائی اور اس کی بہن کی ایک سہیلی اندرون سندھ کے چندروزہ دورہ پر روانہ ہورہے تھے۔ اور ان کے والدین ان کی نصیحتوں اور ہدایتوں کے انبار عطا کرر ہے تھے۔ لیکن بچے (یہ کہ اب صرف والدین کی نظر میں ہی بچہ تھے۔ جو کہ ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہنا تھا) خاصے پراعتمادنظر آرہے تھے۔ اوراس کے باوجودنہایت توجہ سے والدین کی ہدایات سُن رہے تھے۔ والدہ نے خاص طور پر کہا کہ کنجھر جھیل کے اوپر سے دور تک ایک ''مکمل تصویر'' بنا کرلانی ہے۔ میں چھوٹے ہوتے ایک دفعہ گئی تھی۔ ''اماں'' بھی ساتھ تھی اور پھر کھوگئی۔ ''اماں'' کووہ اچھا سا منظر اکثر خواب میں بھی آتا تھا۔ اماں مجھے بتایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں مجھے اچھے خواب کیوں نہیں آتے۔ پھر چپ۔ عابد صاحب نے بات سنبھالی اور کہا کہ میری بات ہو گئی ہے۔ خدا بخش سے تم لوگ سیہون سے سیدھا پھر دادو چلے جانا وہاں سرکٹ ہاؤس میں بکنگ کروادی ہے اور ہاں بیٹا آپ نے مغرب کے بعد موو نہیں کرنا۔ بس دن میں کام کرو اور ہاں سب ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور ہاں یہ کہ۔۔۔۔۔۔۔ اچھا ٹھیک پھر اب آرام کرتے ہیں۔ شاہنواز عابد اٹھا اور اپنا کار کا جنرل view کرنے لگا کہ پانی اور دیگر معاملات ٹھیک ہیں۔ اس نے باہر جا کر دھیان سے یہ چیک کیا۔ اس کی تربیت تھی جو کہ اب عادت بن چکی تھی۔ کہ وہ ہر کام دھیان اور توجہ سے کرتا تھا۔ کیونکہ تربیت تھی اور اب عادت بھی۔ ویسے یہ Research Ques ہے۔ Human Behavior کے Researchers کے لیے کہ اگر تربیت ہی سے عادات develop ہوتی ہے تو پھر جبلت کیا ہے۔

اگر انسان کا رویہ اور عادات اس کی نسلی یا جبلت کی بنیاد پر ہے تو پھر تربیت اور تعلیم کا کیا کردار ہے؟ یہ اگر دونوں ہیں تو پھر اس کی تقسیم کیا ہے؟ اور بھی سوالات کا ایک سلسلہ اس حوالے

سے آتا ہے ذہن میں۔ بہر حال اس نے کار چیک کی اور اندر آیا تو دیکھا کہ اس کی والدہ سامنے کمرہ میں ڈھیر سارے کپڑے نکال کر اس میں سے ان دونوں کے کپڑے علیحدہ علیحدہ کر رہی تھی اور کچھ علیحدہ رکھ رہی تھی سفر کے لیے۔ اس کو اکثر خیال آتا تھا کہ اس کی والدہ نہایت ذمہ دار خاتون ہیں۔ ورنہ اس کے سکول میں اکثر دوستوں کے معاملات عجب سے تھے۔ وہ چپ کر کے دیکھنے لگا کہ اس کی والدہ کیا کر رہی ہیں۔ اس کی والدہ سے ان دونوں کے سفر پر جانے والے کپڑے علیحدہ کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنی والدہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی والدہ اس کپڑے کے انتخاب کے کام میں اس قدر مصروف تھی کہ ان کو بالکل بھی نہیں پتہ چلا کہ وہ ان کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ شاہنواز کچھ دیر یوں ہی دیکھتا رہا اور پھر یوں ہی اپنے کمرہ میں سونے چلا گیا۔

صبح صبح کا وقت تھا جب وہ تینوں Research ورک کے لیے اپنے گھر سے اندرون سندھ کے دورہ کے لیے نکالے۔ وہ اپنے پروگرام کے عین بامطابق ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ ہی کراچی کی ٹریفک اور آلودگی جیسے جیسے وہ سمندر سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ویسے ویسے آلودگی میں اور غربت میں اور گندگی والوں علاقوں کا سلسلہ شروع ہوتا جا رہا تھا۔ اس سب کو دیکھتے، جھیلتے اور محسوس کرتے اور شائد نظر انداز کرتے وہ سپر ہائی وے پر چڑھ گئے۔ اس کی بہن ماروی اور ماریہ آپس میں اپنی باتیں کر رہی تھی اور حسب سابق دھیان سے اپنے کورے چلا رہا تھا۔ سپر ہائی وے پر ٹرکوں اور کاروں کا ایک سیال رواں کراچی کی جانب رواں تھا اور ایک کراچی سے باہر کی جانب۔ نامعلوم اتنے لوگ ہر روز کراچی کیا کرنے آتے ہیں اور اتنے لوگ کراچی سے باہر کیوں جاتے ہیں۔ راستہ میں کھارو کے پاس انہوں نے بریک لگائی اور وہاں ایک روڈ ساصٹ پٹھان ہوٹل سے چائے پی۔ وہاں سے ماریہ کا View of rular Sindh research project شروع ہو گیا تھا۔

ماریہ نے اپنا کیمرہ نکال لیا تھا اور وہ کچھ Clicks لے رہی تھی۔ وہ احترام سے ان کے

ریسرچ ورک ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران دو دفعہ اس نے چائے منگوائی اور پی۔ چائے کمال کی تھی۔ ان تینوں نے اپنے دوستوں سے جو کہ اس روٹ پر سفر کرتے تھے۔ تمام روکنے کے قابل جگہوں کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کی ہوئی تھی۔ یہاں سے نکل کر وہ پھر اگلا سٹاپ ٹھٹھہ سیمنٹ فیکٹری کے پاس کیا۔ وہاں سے کچھ چیزیں خرید کر وہ دوپہر میں شاہ جہاں مسجد کے سامنے جا کر گاڑی روکی۔

گرم دوپہر میں انہوں نے جامع مسجد کا دورہ کیا۔ شاہجہاں کے دور کی اس مسجد میں بھی حسب سابق فوٹوگرافی کا ایک دور اور چلا اور مسجد کی تختی پر لکھی تاریخ اور کہانی ماروی نے نوٹ کی۔ اس کے بعد اس ککے گروپ نے اعلان کیا کہ قریبی گلیوں کا بھی دورہ کرنا اشد ضروری ہے۔ قریبی گلی کا چکر لگاتے اس کو محسوس ہوا کہ یہ دنیا کی اداس ترین اور آوارہ ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔ سارا اندرون سندھ ایسا ہی ہے۔ وڈیرہ اور مخدوم شاہی کا مسکن۔ ہر ضلع کی عوام پر دو چار خاندانوں کی ازلی حکومت۔ اس نے سید عالم محلّہ کے ایک دوکاندار سے پوچھا کہ ''سائیں! یہ ٹھٹھہ کسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟ دوکاندار نے سندھی میں جواب دیا کہ سائیں! سنا ہے کہ بادشاہ شاہ جہاں کے زمانے میں یہ شہر تجارت کا مرکز تھا اور اس میں تاجروں سیاحوں اور تمام ہند سے آنے والوں کا ٹھٹھہ کے گرد ٹھٹھہ لگا رہتا تھا۔ وہی لفظ بگڑ کر ٹھٹھہ بن گیا ہے شائد۔ جیسے کراچی کا نام اور لفظ۔ اس کی سندھی اجرک کی دکان تھی۔ وہ ایسا وضعدار کہ اس کے چہرہ سے لگتا تھا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی کوئی بکری ہو جائے لیکن اس نے منہ سے یہ بات نہیں کی۔ اس کی بہن جو کہ سخن شناس تھی اس نے ایک اجرک خرید کر ماریہ کو دی اور کہا ''تم ہمارے سندھ پہلی دفعہ آئی ہو بہن'' یہ تحفہ وہ بھی خالص سندھیوں والا۔ ماریہ اس تحفہ کو اس خوشی سے وصول کیا کہ جیسا واقعی یہ کوئی حقیقی واقعہ ہو۔ شاہنواز عابد کو خیال آیا کہ ''دنیا میں کتنا کچھ صرف نمائشی اور اضافی ہے۔'' کچھ غیر ضروری بھی شائد'' کیا دنیا میں کچھ بھی بالکل ضروری نہیں؟ وہ حسب سابق سوچوں میں گم ہو گیا کہ خوشی کامیابی اور ضرورت یہ

کیا ہے؟ صرف سوچ یا مشقت بھی۔ خوشی اور کامیابی کی صحیح تشریح کیا ہے اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کامیابی کے لفظ کا معنی اس کے نزدیک کیا ہے؟ اس کو یکدم اس کا کوئی بھی جواب نہیں آیا۔ اس کو سوچ سوچ کے بعد یہ خیال آیا کہ کامیابی شائد خوشی ہے۔ اب اگلا سوال یہ تھا کہ خوشی کیا ہے؟ خوشی خوشی کیا ہے؟ شائد سکول کے اچھے گریڈز۔ لیکن وہ تو ہمیشہ ہی معمول میں ہی آجاتے ہیں۔ پھر کیا زندگی میں قدم جم جائیں تو پھر خوشی مل گئی؟ لیکن زندگی تو لگ بھگ شروع سے ہی جمائی ہوئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں "set" ہے اور اب پھر۔ خوشی کا کیا مطلب ہے؟ کسی دوکان سے یہ ملتی ہے؟ اور اس کی حقیقی اور حتمی معنی کیا ہیں؟ جو کہ ہر ہر کسی پر لاگو ہوسکیں۔ انہی سوچوں میں وہ گم تھا۔ جب ماریہ کی آواز آئی کہ ٹنڈو محمد خان یا حیدرآباد کے راستہ میں کسی مندر میں بھی رکنا ہے۔ کیونکہ قدیم سندھ کی تہذیب ہندو کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ قدیم اور جدید سندھ ویسے پتہ نہیں کتنے سندھ ہیں۔ ایک اربن ہے ایک دیہی ہے ایک قدیم اور ایک جدید۔ ماروی کہنے لگی کہ "اماں اکثر ذکر کرتی ہیں کہ ہم بھی قدیم سندھ کے وقت ہندو تھے۔ سرسوت برہمن تھے شائد اماں کے اباء۔ سندھ پر حملہ کے وقت وہ بھاگ گئے تھے۔ ملتان کی سمت میں لیکن پھر واپس آگئے۔ پھر وہ دور آیا جب عام سندھیوں کا مذہب شائد انسانیت اور صوفی ازم بن گیا۔ بنیادی طور پر سب کچھ نہ کچھ تھے لیکن تمام سندھی با حیثیت مجموعی اپنے صوفی اور پیروں کو مانتے تھے۔ تمام بڑے صوفی اور بزرگوں کا ایک ایک ہندو نام تھا اور ایک ایک مسلم۔ سب ہی ان کو عقیدت سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ 1950ء کے عشرہ کے آخر میں کراچی اور حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فسادات ہوگئے۔

جس طرح قدیم عربوں اور ایرانیوں اور ہندوں میں دیوی دیوتا تھے۔ ویسے ہی سندھ میں بھی مختلف مزاروں کو مختلف چیزوں کے لیے مخصوص کرلیا گیا تھا۔ ایک عجب سماجی نظام تھا۔ ہر کوئی ہر قابل احترام شے کا انسانی بنیادوں پر احترام کرتا تھا۔ اور جیو اور جینے دو کی پالیسی تھی۔ یہاں تک کہ رمضان شریف اور محرم الحرام کا تمام گروہوں میں یکساں احترام تھا۔ عام سندھی جیسے کہ اس

کی ماں وہ آج بھی سب مذاہب کا احترام کرتی ہے اوران کے شعائر کا بھی۔ یہاں تک کہ ان کو ٹنڈو محمد خان کے راستہ میں ایک مندر کے گنبد نظر آئے۔ انہوں نے شاہنواز کو کہا کہ وہ کار اس سمت لے جائے۔ وہ کار کو مندر کی جانب جانے والی سڑک پر موڑ کر مندر کی جانب لے گیا تو مندر ابھی تک آباد تھا۔ انہوں نے مندر میں جا کر چند clicks لیے۔ مندر میں پنڈت جی سے ملے تو نا معلوم کیوں۔ شاہنواز نے ان سے پوچھا کہ سندھ کا مشترکہ سماج اور مذہب کہاں گم ہو گیا؟ کوئی 90/80 کا برف جیسے سفید بالوں جیسا بابا جو کہ تمام عمر اس مندر میں پنڈت بن کر بیٹھا رہا۔ اس سوال کو کہ مشترکہ سماج کہاں گم ہو گیا؟ سن کر خود بھی گم ہو گیا

اور پھر چند لمحہ کے بعد بولا سائیں! ہر شے کو کھا گئی۔

شاہنواز نے پوچھا: کیا؟

پنڈت بولا: بھوک کی دیوی۔

پھر بولا: جب تھر کے اس پار نیا ملک بنا۔ میں کوئی 25 برس کا تھا۔ کوئی 5/7 برس میں یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم ایک اور دوریا زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ آج اس خطہ کی آبادی شائد 1.5 ارب ہے۔ انسانوں کی نفسیات وہ کیا کہتے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کا طریقہ یکسر بدل گیا۔ ان کا عمل اوران کا ردعمل۔ ان کی پسند۔ ان کے جذبات سب ہی بدل گئے۔ یہ تو ہمارے گوٹھ کے وڈیرہ سائیں بہت مضبوط انسان تھے۔ سائیں مالک نواز جن کی وجہ سے ہم بچ گئے

ورنہ۔۔۔ سب کھا گئی۔ بھوک کی دیوی۔ کچھ نہیں بچا۔

شاہنواز نے کہا کہ لیکن آپ لوگ تو ابھی تک باقی ہیں نا۔۔۔۔ پنڈت بولا: ہاں اس کی وجہ ہے کہ ابھی تک ہم پر ہوس کی دیوی کا قہر نہیں نازل ہوا۔ جس دن ہم پر بھی جیسے باقی سب پر ہوا۔ ہوس کی دیوی کا قہر نازہوا نا سائیں ہم بھی باقی نہ ہو گے۔ ورنہ سوال تو یہ ہے کہ جو سندھی دھرتی ہزاروں سالوں سے انسانوں کو پال رہی تھی۔ وہ بانجھ تو نہ ہوتی تھی۔

یہ ہوس کی دیوی ہی تھی نا۔ جس کی وجہ سے ہزاروں سالوں سے ساتھ رہنے والوں نے ایک دوسرے کو مارا۔ لیکن یہ سب ہونا ہی تھا۔ کیونکہ تمام دکھ ہے اس دنیا میں ۔
شاہنواز نے اس کی بات سن کر چپ چاپ آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے بعد وہ حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات وہ بالآخر اپنے رات بسر کرنے کی جگہ جو کہ ان کے والد کی کمپنی کے ایک افسر کا گھر تھا پہنچ گئے۔

دوسرے روز گرمی بلا کی پڑ رہی تھی۔ جب وہ حیدر آباد شہر سے نکل کر سکھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک مشہور مقبرے پر رکے۔ دھوپ نہایت سخت، گرد کے جھکڑ رواں تھے۔ اور شاہ بادشاہ کے مقربے کے محرابوں کے نیچے چرس پی پی کر خونی لال آنکھوں والے فقیر اور گندے کپڑوں میں بھیگ مانگنے والی عورتیں اور چرس پیتے ہوئے مختلف عمروں کے لڑکوں کا رش تھا۔ ہر شخص وعورت کو دیکھ کر شاہنواز کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کیا خوفناک شکل وحلیہ تھا۔ ان سب کا۔ کان میں بڑے بڑے زیور گلے میں ہار اور ہاتھوں میں کڑے اور بھانت بھانگ کے لوگ۔ کچھ کے لباس سے لگتا تھا کہ وہ سیاح ہیں اور کچھ کے سے کہ وہ مستقل وہاں پر ہی مقیم ہیں۔ ماریہ نے یہ سب دیکھ کر ہولے سے کہا کہ ''یہی سب تہذیب اور طرز زندگی ہے؟؟ شاہنواز عابد کوشش کہ باوجود یہ محسوس نہ کر سکا کہ یہ جملہ ایک جنرل کمنٹ ہے یا کہ طنزیہ تبصرہ۔ لیکن جو بھی تھا۔ تھا ایک حقیقت۔ ماروی جو کہ اس طرح کے مشکل سوالات کا جواب دینے کی عادی تھی۔ اس نے کہا : ماریہ! دیکھ ساری اقسام کا لاکھوں کروڑوں لوگوں نے بار بار برتاء ہے۔ ایسا ازل سے ہو رہا ہے اور اب تک ہوتا رہے گا۔ لوگ ایسے ہی مسائل زدہ تھے اور ویسے ہی اب تک ہیں۔ ایسے ہی ایک دوسرے سے امید لگاتے ہیں اور ایسے ہی ایک دوسرے سے مایوس ہوتے ہیں۔

بہن ماریہ! قصہ مختصر کسی کو صوفی ازم میں پناہ ملی ہے اور کسی کو چرس کے کش میں اور کسی کو خیرات کی دال جو کہ ان مقبروں پر مسلسل میسر ہے۔ وہ کسی کی ضرورت ہے اور کچھ ہمارے جیسے

سماجی سائنس دان کی بھی ضرورت ہے کہ زمانہ میں سماجی مسائل ہو۔ جن پر وہ تحقیق کر سکیں۔ بس تو جناب! قصہ کوتاہ یہ کہ دنیا ایسی ہے اور ایسی ہی رہنی ہے۔ اب آپ بس جلدی سے دو تین اچھے سے clicks لو اور پھر ہم نکلتے ہیں کیونکہ چرس کا دھواں میرے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔ شاہنواز عابد جو کہ چپ کر کے یہ سن رہا تھا۔ اس نے کہا "ہاں مجھے بھی کچھ ہو رہا اس دھواں سے۔ بس نکلیں یہاں سے۔ ماریہ نے جلدی جلدی چند تصویریں بنائیں اور کار میں واپس آ گئی۔ ماریہ کودے کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی۔ بے وجہ ماروی سے پوچھتی ہے کہ "ایک دوست کے لیے دوسرے دوست سے نہایت مایوسی کا لمحہ کون سا ہوتا ہے۔

ماروی کو فوراً ہی اس سوال کا جواب جیسے آ جاتا ہے۔

وہ بولی: جب وہ اس کے پاس سہارے کے لیے جائے لیکن وہ اس کو سہارا دینے سے انکار کر دے تو۔ اور ویسے بھی بڑے عذابوں میں ایک عذاب ٹوٹنے کا عذاب ہے۔ وہ بے شک امید یا دل یا توقعات کا دھارا۔ بس تم اپنے جماعت خانہ میں دعا کرنا کہ کسی کا کچھ ٹوٹے نہ کبھی۔ کیونکہ پھر آدمی کو پناہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور آج کل ہمارے سماجی نظام کو ٹوٹے ہوئے لوگوں کو پناہ صرف یا تو مقبروں پر ملتی ہے یا پھر نشہ کے گروہوں میں اور ہر دو کا حال آپ کو بھی پتہ ہی ہے جو ہے۔ بس

شاہنواز نے چپ کر کے یہ بات سنی۔ دل میں سوچا کہ اس کی بہن کا زندگی کا مشاہدہ کتنا بے رحمانہ کتنا حقیقت پسند اور کتنا تکلیف دہ اور کتنا گہرا اور کتنا پختہ ہے۔ نا معلوم کیسے اور کہاں سے اس کو یہ خیالات آتے ہیں۔ اور اس کو ہی کیوں آتے ہیں۔ مجھے کیوں نہیں آتے۔

اور یہ ہی زندگی کا دھارا ہے جو کہ ازلوں سے ایسا ہی بہہ رہا ہے اور اس میں ہم سب پس رہے ہیں اور اب تک یہ ہی ہونا ہے۔ یہی رنج یہی معاشرہ اور سماج کے فیصلے نہ نہ فیصلے نہیں بلکہ حکم۔ اس کی بہن ماروی اور ماریہ راستہ میں یہی باتیں کرتی رہی کہ عام ہاری جو کہ سندھ کا اصل باشندہ اور مالک

ہے۔اس کے متعلق کوئی پالیسی کیوں نہیں بناتی۔وہ اس وقت روہڑی کے پاس سے دریائے سندھ کے کنارے کنارے گزر رہے تھے۔مہران اپنے عروج پر تھا۔ویسا ہی کشادہ ویسا ہی وسیع ویسا ہی زورآور۔اس کے کئی کلومیٹر کے پل پر کاروں، تانگوں اور موٹر سائیکل کی بتیاں کیا دلفریب منظر تھا۔ صدیوں سے سب یونہی چل رہا تھا۔

دن کا آغاز حسب معمول ویسا ہی تھا۔سکھر میں وہ لوگ ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔پیپل کے بوڑھے درختوں میں ایک مندر تھا اس مندر کا پنڈت کی بیٹی ماروی کے ساتھ یونیورسٹی میں تھی اور وہ آج ان کو یہ تاریخ وقدیمی مندر دیکھنے کے لیے لائی تھی۔لکشمی کی شادی یونیورسٹی کے پہلے سال میں ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ یونیورسٹی چھوڑ گئی اور ویسے بھی سندھ میں کلچر اسٹڈیز کو کوئی scope نہ تھا اب وہ اپنے میاں کے ساتھ کورنگی کے علاقہ میں رہتی تھی اور آج کل سکھر آئی ہوئی تھی۔لکشمی کا باپ ایک روایتی پنڈت تھا۔جو کہ پورے برصغیر کے طول وعرض پر ہر جگہ پر ایک ہی جیسے پائے جاتے ہیں۔ویسے ہی جیسے کاشی میں تھے ویسے ہی جیسے بنارس میں تھے ویسے ہی اس جگہ پر بھی تھے۔اسی دوران ایک بوڑھا شخص پھولوں کا گلدستہ بنا کر ان کے لیے لایا۔ اس نے مسکرا کر وہ گلدستہ ان سے لے لیا۔روایتی لوگ تھے اور روایت یہ تھی کہ مہمان کو تحفہ دینا چاہیے اور بہترین تحفہ پھول ہوتے ہیں۔پھول بھی وہ جن سے خوشبو آئے۔شاہنواز سوچنے لگا کہ کراچی میں نہ تو پھولوں سے خوشبو آتی ہے اور نہ ہی لوگوں کی باتوں سے پتہ نہیں کہاں چلی گئی ساری خوشبو۔مندر کے اندر ایک مورتی تھی۔جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ خالص سونا کی ہے۔اس کی ماریہ نے چپکے سے تصویر لے لی۔اس کے بعد بھوجن کیا اور واپس شہر کی طرف آئے۔شہر میں ترقیاتی کام کچھ نہ کچھ ضرور ہوا تھا۔لیکن اُس کے باوجود ہر سمت ایک اداسی اور بے رنگی اور گرد دھول ہمہ وقت اُڑتی رہتی ہے۔فرنگی کے زمانہ کا ریلوے اسٹیشن خستہ سڑک کے کنارے اور بھی ٹوٹا پھوٹا سا لگ رہا تھا۔اس میں سے تھکے تھکے مسافر اور چست قلی نظر آ رہے تھے۔وہ سر شام واپس

سکھر ریسٹ ہاؤس پہنچے۔

کراچی، سکھر ہائی وے پر کورے اپنی size اور speed کے حساب سے بہت تیزی سے واپس کراچی جا رہی تھی۔ کار کے ائرسسٹم سے صحرا کی خنک ہوا آ رہی تھی۔ بیک شیشہ میں ماریہ اپنے چاندی کے کنگن سے کھیل رہی تھی۔ ماروی اپنے نوٹس کو ترتیب وار اور نمبر وار کر رہی تھی۔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام ہلکا ہلکا سا چل رہا تھا۔ اطراف میں خیر پور کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ اونچے گرد آلود درخت اور انگریزی دور کی عمارتیں اور سڑکیں۔ وہ تیزی سے اس منظر کو پیچھے چھوڑتے آ رہے تھے۔ اور حیدر آباد شہر میں ٹھنڈی سڑک پر شام سے کچھ پہلے وہ پہنچ گئے۔ وہاں پر روایتی کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ کراچی کی جانب روانہ ہوئے۔ چاندنی رات پر ہائی وے پر اتر آئی تھی۔ ماریہ بولی: ماروی تم کتنی فضول ہو؟ ماروی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور کہا: کیوں؟ ماریہ بولی: تم نے مجھے سندھی بالکل بھی نہیں سکھائی۔ حالانکہ اس دن چنہ صاحب کہہ رہے تھے کہ سندھی اور اردو کا سکرپٹ basic ایک جیسا ہی ہے۔ ماروی میں ایک طرح کا انکسار تھا یا دھیما پن اس نے اس بات یا الزام کا کوئی جواب دینا مناسب ہی نہیں سمجھا۔ اور وہ لیاری ایکسپریس وے پر چڑھ گئے اور جلد ہی کلفٹن کی روشنی نظر آنے لگی۔

کراچی اس پر رواں دواں تھا۔ شہر کراچی آخری خبروں کے مطابق دنیا کی سب سے بڑی شہری آبادی۔ دنیا کا سب سے بڑی کچی آبادی رکھنے والا شہر جو کہ پچھلے کئی عشروں سے نا جانے کس کس کی میزبانی کر رہا ہے۔ ملک کا قریب آدھا زر پیدا کرنے والا شہر۔ جس کا آج کوئی بھی حقیقی سپوت نہیں ہے۔ ہر کوئی جس کو کام نہیں ملتا۔ جس کو نوکری کرنی ہے جس کو کاروبار کرنا ہے یا جس کو کوئی جرم کرنا ہے۔ جی ہاں! ہر جرائم پیشہ کا پورے پاکستان و افغانستان میں پسندیدہ شہر۔ جس کی گلیاں غربت کی چھت اور چور کا پردہ دونوں امور کے لیے بہترین قریب 2.5 کروڑ لوگ ہزاروں تنگ گلیاں۔ ہر طرف بظاہر زندگی لیکن ساتھ ہی ہر سمت موت بھی رواں۔ دنیا کا سب سے غریب

پرورشہر لیکن ساتھ ہی دنیا میں جس شہر میں لوگ رات کو بھوکے کھلے آسمان تلے سوتے ہیں وہ بھی کراچی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ جھونپڑیوں اور کچی آبادیوں کا سلسلہ جس میں عالمی شہرت یافتہ کچی آبادیاں مثال اورنگی Orangi جہاں اختر حمید جہاں زندہ آدمی پیدا ہوا۔ پیدا وہ پہلے ہو گئے۔ مطلب وہاں آئے اور اورنگی پائیلٹ پروجیکٹ شروع کیا۔ اور ایک عالمی مثال یا کارنامہ کر دکھایا۔ جیسے اسی شہر کے ایک آدمی ''عبدالستار ایدھی'' نے دنیا کی سب سے بڑی فری ایمبولینس سروس شروع کر کے کیا۔ شاہنواز عابد کو یاد آیا کہ اس کے پروفیسر صاحب ذکر کر رہے تھے کہ اختر حمید خان / عبدالستار ایدھی / سیلانی اور اس طرح کی تنظیمیں اور آدمی کا ہونا۔ اس بات کی تو علامت ہے کہ کوئی چراغ ابھی بھی جلتا ہے۔ لاکھوں میں۔ لیکن اس بات کا بھی اعلان ہے کہ با حیثیت مجموعی معاشرہ مردہ ہو چکا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ اپنی گندگی کم از کم کسی بڑے ٹوکرے میں ڈال دے۔ کسی کو شرم نہیں کہ وہ جو کہ ٹاؤن بنا رہا ہے یہ بھی سوچ لے کہ یہاں جس انسان نے رہنا ہے اس کو پیشاب بھی آنا ہے اور اس کا نکاس ہی کر دو۔ اگر اورنگی کا سلم slum نہ ہوتا۔ اگر ہم دنیا میں سب سے پیچھے نہ ہوتے اگر 20/25 لاکھ افراد گندگی کے دلدل میں نہ ہوتے تو ہمیں اختر حمید خان جیسے عظیم آدمی درکار ہی نہ ہوتے اگر بے کفن لاشوں کو جن کا جرم یہ تھا کہ وہ جیب میں دو تین سو لے کر بازار میں کیوں نکلے۔ نہ ہوتے تو ہم کو عبدالستار نہ چاہیے ہوتے۔ اگر ہم اچھے لوگوں کو ووٹ دیتے۔ اس ملک کو اپنا سمجھتے اس شہر کو own کرتے۔ اچھے ہسپتال بناتے تو ہمیں کسی شوکت خانم ہسپتال کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی اچھا social see system ہوتا تو ہمیں کسی SOS کے یتیم خانہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر ملین آف ملین لوگ شاہراہ فیصل کے، لانڈھی کے اور لیاری ایکسپریس وے کے پلوں کے نیچے بھوکے نہ پڑے مر رہے ہوتے تو ہمیں کسی سیلانی کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور اگر ہمارے ملک میں گورنمنٹ کو یاد ہوتا ان کو جن کو ہم 5 نسلوں سے الیکشن میں ووٹ دیتے ہیں ان کو یاد ہوتا کہ آٹا دال گھی کو تو کم از کم black نہیں ہونا چاہیے تو

ہمیں کسی ایثار، رعایتی تھیلے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر ہماری صوبائی حکومت کو یاد ہوتا کہ یہ بچہ جو کہ ہائی سکول پاس کر چکے ہیں ان کو کسی career counseling کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں کسی آگہی ورکشاپ کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ لوگ بے شک عظیم ہیں لیکن ایہ اختر حمید خان / عبدالستار ایدھی، یہ سیلانی، یہ شوکت خانم ہسپتال یا ایثار آگہی جیسے ادارہ اس بات کا بھی اعلان ہیں یہ معاشرہ بحثیت مجموعی ختم شد ہو چکا ہے۔ اور اب اس مردہ معاشرہ کا علاج ہو رہا ہے شاہنواز عابد کا خیالات کا سلسلہ اس بات سے ٹوٹا جب اس کی بہن نے اس کو کہا: اوں آپ راستہ بھی بھول گئے، ماریہ کے گھر کو یہاں سے مڑنا ہے۔ اوں ہاں! سوری میں ابھی آگے سے موڑتا ہوں۔ ماریہ کو گھر چھوڑ کر وہ اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔ لیکن سی ویو سے پہلے طویل وعریض ٹریفک جام ان کا منتظر تھا۔ ماروی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ یہ شہر بھی پھٹ گیا ہے۔ ہر سمت انسان ہی انسان اور ٹریفک ہی ٹریفک۔ اور ہارنوں کا شور۔ اس کا دل چاہا کہ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ کسی خیر پور یا ٹھٹھہ جیسے شہر میں رہتے۔ کم از کم یہ آلودگی اور ٹریفک کا عذاب تو نہ ہوتا وہاں پر۔ شاہنواز عابد نے ساتھ والی گلی سے شارٹ کٹ کرنے کرنے کی کوشش کی جو کہ جزوی طور پر کامیاب رہی۔ لیکن آگے پھر Traffic load زیادہ تھا۔ لیکن یہاں پر Traffic Load تھا۔ Jam نہیں۔ بالآخر کوئی 1.5 گھنٹے کی جدوجہد کے بعد رات کوئی 10 بجے وہ گھر پہنچنے میں کامیاب ہوئے

شاہنواز عابد کا معمول تھا کہ وہ رات جب بھی سوتا تھا لیکن صبح 8 بجے تک جاگ جاتا تھا۔ لیکن آج 9 بجے سے اوپر کا عمل تھا لیکن وہ ابھی تک نہ جاگا تھا۔ اس کی والدہ نے سوچا کہ بچہ سفر سے آیا ہے تو چلو کوئی نہیں۔ لیکن جب گھڑی نے 10 بجے سے بھی اوپر بجائے تو ان کا دل چاہا کہ اب بس بہت ہے۔ انہوں نے جا کر اس کو اُٹھایا۔ شاہنواز عابد نے جب ٹائم دیکھا تو وہ خود بھی اُٹھ بیٹھا۔ کیونکہ جس طرح کی زندگی وہ کر رہا تھا۔ اس ڈھپ پر لانے میں اس کو اپنی خواہش کا عمل دخل بھی تھا۔ اس نے اُٹھ کر فون دیکھا تو اس پر یونیورسٹی کے نمبر سے 3 دفعہ کال آ چکی تھی۔ وہ ابھی باتھ

سے نکلا ہی تھا کہ اس کا فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ اسی کے کلاس ٹیچر کے نمبر سے تھا۔ اس نے فون اُٹھایا تو سر شکیل: یار! تم اتنے غیر ذمہ دار تو کبھی نہ تھے؟ کمال ہے صبح سے تمہارا نمبر نہیں مل رہا؟؟ شاہنواز عابد: جی سر! وہ آج اُٹھا لیٹ تھا۔ سر شکیل: اچھا! بھائی مبارک ہو تمہارا نام امریکہ کے فلم scholorship میں آ گیا ہے تیاری کر لو اب بس فوراً سے امریکہ جانے کی تم۔ اور ہاں آج لازمی چکر لگا ؤ یونی ورسٹی کا بھی کیونکہ کچھ اور فارم پر کرنے ہیں اور وہ آج کل میں لازمی امریکہ روانہ کرنے ہیں۔ شاہنواز عابد: ٹھیک سر! میں آج آتا ہوں۔ سر لیکن میں نے کب جانا ہے؟ سر شکیل: بیٹا! آپ لوگ 15 دن میں روانہ ہونا ہے۔ بہر حال آپ آؤ تو تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ شاہنواز امریکہ جانے کی خوشی میں بہت زیادہ پر جوش ہو گیا اور اس کی خماری تمام اُڑ گئی۔ وہ فوراً سے نیچے آیا اور اپنی والدہ اور والد کو بتایا کہ وہ وظیفہ کے لیے qualified ہو گیا ہے۔ اور وہ 15 دن میں امریکہ روانہ ہونے لگا ہے۔ یہ سن کر اس کے والدین بھی بہت خوش ہوئے لیکن والدہ نے وہی روٹین کی مسکراہٹ اور والد صاحب نے ذرا ہنس کر مبارکباد دی۔ اور اس کے بعد ادھورا سا ناشتہ کر کے وہ یونیورسٹی کے لیے نکل پڑا۔ راستہ میں اس کو فون پر اس کی کلاس فیلو شازیہ کا فون آیا۔ کہ وہ بھی اسی گروپ کے ساتھ امریکہ جا رہی ہے اور یونی ورسٹی اگر آئے تو واپسی پر اس کے ساتھ دفتر چلے۔ اس نے اس کو کہا کہ "یار! ابھی یونیورسٹی آتا ہوں پھر دیکھتا ہوں کہ کیا مصروفیت ہے اس کے بعد آپ کو بتا سکوں گا کہ کیا کرنا ہے؟ اس کے اس جواب پر شازیہ نے تھوڑا سا غصہ کیا اور اس کے بعد فون بند ہو گیا اور وہ ذرا تیز رفتاری کرتا ہوا یونیورسٹی پہنچا۔ یورنیورسٹی سے دو چوک پیچھے سڑک کو پولیس نے بند کیا ہوا تھا کہ یونیورسٹی روڈ سے کچھ آگے ایک محل ہے اور محل کے باسی نے اپنے گھر جانا ہے۔ اس لئے کوئی اب نہ اپنے گھر جا سکتا ہے اور نہ باہر آ سکتا ہے۔

شاہنواز عابد کے کچھ سکول کے دوست لندن میں تھے۔ انہوں نے اس کو کہا کہ

via لندن فلائٹ لے۔ جس کا لندن میں چند گھنٹہ کا stay ہو۔ وہ اس کو ائیر پورٹ پر مل لیں گے۔ لندن کے ائیر پورٹ پر بہت رش تھا۔ کچھ حصہ میں کام ہو رہا ہے۔ جو کہ پولش اور پاکستانی لیبر کر رہی تھی۔ شاہنواز عابد لاؤنج میں آیا تو ایک دنیا اندر تھی۔ ایک حقیقی انٹرنیشنل ائیر پورٹ کا منظر۔ شائد روئے زمین کی ہر نسل کے ایک ایک بندہ اس وقت اس ائیر پورٹ پر موجود تھا۔ لندن سے فلائیٹ میامی گئی اور وہاں سے ایک connecting فلائٹ کے ذریعے شاہنواز عابد بوسٹن پہنچا۔ ان کے گروپ کی ابتدائی تربیت بوسٹن میں ہی ایک یونیورسٹی میں تھی۔ بعد از انہوں نے مختلف جگہوں کا دورہ کرنا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ عام امریکی اور خاص طور پر تعلیمی شعبہ سے منسلک لوگ خاصے دوستانہ رویہ کے ہوتے ہیں۔ وہ ائیر پورٹ کے لاؤنج میں ہی تھا۔ جب ایک چینی لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں شائد انگریزی جوڑی ہوتی تھی لیکن لہجہ اور تلفظ ٹوٹا ہوا تھا میں کہا" ہیلو! تم شاہنواز ہو نا؟ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: جی میں ہی ہوں۔ اس نے کہا کہ میں لی ہوں۔ تمہاری campus guide۔ تم کیسے ہو آج کی دوپہر؟۔ شاہنواز عابد نے کہا کہ" میں ٹھیک ہوں" اس کے بعد اس نے اس کو سامان کسٹم کروانے میں مدد کی اور اس کا آدھا سامان خود اُٹھا کر وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ ائیر پورٹ سے باہر آئے تو اس نے نہایت بے تکلفی سے جیسے پتہ نہیں کب کے دوست ہو۔ اس سے پوچھا کہ ہاں لڑکے؟ کیا کھاؤ گے لنچ میں؟ وہ باہر آئے تو لی اس کو لے کر پرائیویٹ کاروں کی پارکنگ کی طرف لے گئی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی کار تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے اور بوسٹن میں نکل گئے۔ بوسٹن بھری سرد دوپہر میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شاہنواز عابد حیرت سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اس کے اردگرد دنیا پھیلی تھی اس کے اردگرد زندگی پھیلی تھی اور اس کا مستقبل بھی۔ وہ حسب عادت چپ بیٹھا تھا۔ لی سمجھی کہ شائد نیا ہے نا اس لیے چپ ہے۔ وہ اس کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں۔ شاہنواز ON نہیں ہوا۔ لیکن لی بھی دھن کی پکی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ" کیا کھاؤ گے؟ اس نے جواب دیا کہ

"کچھ بھی۔ میں زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ ہر چیز ہی ٹھیک ہے"

گاڑی چلتے ہوئے لی اس نے بے دھیانی میں کار کا میوزک سسٹم آن کیا اور اس کو حیرت کا جھٹکا لگا جب اس کے کانوں میں "غم ہے یا خوشی ہے تو" کی آواز آئی۔ ہائیں ۔۔۔۔لو بھی نصرت فتح علی خان کی قوالی سنتی ہے ؟؟ لیکن وہ چپ کر کے بیٹھا رہا۔ لی نے ایک McDonald کے باہر کار پارک کی اور اس کو لے کر اندر گئی۔ انہوں نے روایتی امریکی ورکنگ لنچ کیا۔ اور لنچ کے دوران اس نے اس سے پوچھا کہ کراچی کیسا تھا اور اس کی فیملی کتنے لوگوں پر مشتمل ہے؟ اور پھر اس سے اس کو بتایا کہ وہ چینی والد اور تھائی والدہ کی اولاد ہے اس کی والدین بھی 30 سال قبل امریکہ تعلیم کے لیے آئے تھے اور پھر دونوں نے شادی کر لی اور امریکہ میں ہی بس گئے چونکہ وہ ایشیائی تھے اس لئے قدر رومانٹک تھے ورنہ عام امریکیز زندگی میں خشکی ہے۔ نہ ان کو حسن کا پتہ نہ عشق کا۔ امریکہ دنیا سے ہر طرح الگ ہے۔ جغرافیائی طور پر بھی اور طرز زندگی کے طور پر بھی اور روزمرہ کی زندگی کے طور پر بھی۔ شاہنواز عابد کا ہائی سکول امریکن تھا۔ اس کا تاثر امریکہ کے بارے میں امریکی کے بارے میں اچھا ہی تھا۔ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ امریکی کلچر کا اپنا مزہ ہے اور ان کا لائف سٹائل کا ایک الگ claim ہے۔ لی نے اس کو لنچ کے بعد بوسٹن کے وسط میں واقع ایک ہاسٹل میں ڈراپ کیا اور "صبح ملتے ہیں" کہہ کر چلی گئی۔ نیا ملک سرد موسم اور ہوسٹل کا نیا کمرہ شاہنواز عابد نے اردگرد پر غور کیا کہ یہ کیا کیا ہو گیا اور کیسے کیسے؟؟ کہاں کراچی کہاں بوسٹن۔ کہاں گھر کا کمرہ کہاں یہ ہوسٹل نما عمارت کا کمرہ۔ اس کو اس سب پر غور کر کے خوشی ہوئی اور دل میں امریکی حکومت اور امریکی حکومت کے تعلیمی نظام اور دنیا بھر میں ملنے والے scholarship programs کے لیے اس کے دل میں تشکر کے جذبات ابھرے۔ اس کی آنکھیں اس لمحہ بند تھی اور نا معلوم کیوں اس کامل تنہائی میں اس نے ہولے سے کہا. Thank You

اگلی صبح لی اس کو ہاسٹل سے صبح پک کر کے فلم سکول لے کر آئی۔ راستہ میں اس نے اس کو

سٹی ٹرانسپورٹ سسٹم کے بارے میں بھی سمجھایا تا کہ آنے والے دنوں میں اس کو مسئلہ نہ ہو۔فلم سکول شہر کے مضافات میں ایک کھلی جگہ پر تھا۔ کچھ عمارتیں اردگرد کھلے میدان تھے۔ان کے گروپ اس کے علاوہ مزید ۲ پاکستانی تھے باقی 35 رکنی گروپ میں تمام غیر ملکی ہی تھے۔ پہلا دن تو ان کو Campus Tour اور Class Intro میں ہی گزر گیا۔فلم سکول کی مختلف عمارتیں اور اسٹوڈیوز دیکھتے دیکھتے دوپہر ہوگئی۔اس کے سکول سے کراچی سے شازیہ تھی۔ جبکہ ایک لڑکی لاہور کے NCA سے تھی۔ وہ تینوں اور ایک بنگالی لڑکا جسیم اور ایک کلکتہ کی لڑکی ''پارما'' یہ پانچوں کا گروپ غیر محسوس انداز میں بن گیا۔شازیہ ان کی گروپ لیڈر بھی از خود بن گئی۔دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ سرد دوپہر کی دھوپ سے محظوظ ہونے کے لیے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں آ بیٹھے۔''پارما'' کراچی اور کلکتہ کا موازنہ کرنے لگ پڑھی کہ زیادہ خوبصورت شہر کون سا ہے۔شازیہ نے کہا کہ ''اگر ہم یہ بات کریں کہ زیادہ گندااور غربت زدہ شہر کون سا ہے تو یہ بات جلدی کسی نتیجہ پر پہنچ جائے گی۔اس کے بعد وہی بوجھل اور بیزار کن نمبر اور اعدادوشمار کہ کتنے لوگ بے گھر اور بھوکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح کی باتیں جاری تھیں کہ شاہنواز عابد چپ کر کے اُٹھا اور اردگرد پھیلی خوبصورت سبزہ و درختوں کو دیکھنے لگا۔ بہت عالی شان اونچے درخت موجود تھے اس لان میں۔ گھنے سایہ دار اور بافیض جیسا کہ سب درخت ہوتے ہیں۔ وہ ان کے اردگرد دیکھنے لگا۔ بالکل صاف ستھرے تنے اور لان پڑا تھا۔ کچھ پرانے پتے تھے اور بس۔ ہلکی ہلکی آوازیں اس بحث آرہی تھی جو کہ نیوز شازیہ اور پارما میں جاری تھی۔ دونوں میں دوقدریں مشترک تھی۔ دونوں انتہائی مسئلہ زدہ علاقوں سے تھی لیکن ذاتی طور پر امراعات یافتہ طبقہ سے تھی۔لیکن دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اہل درد ہیں۔

درد جو کہ دنیا کا واحد رشتہ ہے۔ بلکہ شائد دنیا میں دو رشتے ہیں۔ایک درد کا اور ایک مفاد کا باقی سب کہانی ہے۔سب افسانہ ہے۔ سب قصہ ہے۔ یہ ان دو کے اردگرد بنائے ہوئے ہیں

لیکن دھوکہ کے لئے نام ایک سے زیادہ رکھے ہوئے ہیں۔ دھوکہ بھی وہ والا جو کہ لوگ فقط اپنے آپکو دیتے ہیں۔ اور پھر اس دھوکہ میں جیسے چلے جاتے ہیں۔ یہ منافقانہ معاشرتی نظام پورے مشرق میں اب تک جاری ہے اور اس بے فی نظام کا صرف نقصان ہی ہے۔ بس اسی سے دنیا ازل سے۔۔۔۔۔

وہ بھی اک سرد صبح تھی اور وہ ابھی روزمرہ کی زندگی کی یکسانیت سے بور نہیں ہوا تھا اور ابھی زندگی دلوں میں باقی تھی۔ وہ اٹھا اور نہانے کا تکلف کیے بغیر کمرے سے نکلا اور اپنے آپ کو گردونواح سے متعارف کروانے لگا۔ سڑکوں پر رش کے گھنٹے شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اسی نے باہر سڑک پر ایک دکان میں دیکھا کہ بیکری type شاپ تھی اور ایک بوڑھا امریکی اس میں بریڈ بیک کر رہا تھا۔ وہ اندر چلا گیا تو اس نے اس کو انگیرزی میں کہا: سر! ناشتہ کے لیے کچھ ہو گا؟ بوڑھا امریکی مسکرایا: ہاں! ضرور۔ اس نے اس کو جام اور بریڈ دی اور کریم کونی بھی۔ شاہنواز عابد نے چپ کر کے کھانا شروع کیا اس نے بریڈ کو بیک کرتے کرتے اس سے باتیں شروع کی۔ شاہنواز نے اس کو بتایا کہ وہ طالب علم ہے اور ادھر ساتھ ہی ایک عمارت میں رہتا ہے۔ بوڑھا امریکی نے اس کو غور سے دیکھا اور بولا: کس شہر سے کراچی یا جے پور یا گجرات کے کسی علاقہ کے لگتے ہو۔ شاہنواز حیرت زدہ رہ گیا۔ بابے کے اندازے پر۔ اس نے آہستہ سے کہا کہ "کراچی"۔ امریکی بوڑھے نے کہا: اب تو کراچی پتہ نہیں کیسا ہوگا۔ میں 30 سال قبل ایک فلاحی ادارے کے ساتھ سیلاب کے ریلیف کے سلسلے میں کراچی گیا تھا اور 2 ماہ رہا تھا کراچی میں اس وقت امن تھا اور زندگی بھی۔

شاہنواز کو بالکل سمجھ نہ آئی کہ وہ اس بات کے بعد کیا رائے دے یا کیا جواب؟۔

بوڑھے نے کہا: ویل نوجوان میں بل ہوں۔ شاہنواز نے بھی اپنا نام بتایا۔ پھر پوچھا کہ سنا ہے اب پورے ساؤتھ ایشیاء میں باحیثیت مجموعی ہی امن وامان کے معاملات بس ایسے ہی

ہیں۔شاہنواز عابد نے کہا: جنوبی ایشیاء کا تو مجھے نہیں پتہ۔لیکن کراچی میں تو حالات۔۔۔۔سرشام ہی اکثر علاقوں میں موت رواں ہو جاتی ہے۔وہ اپنا ناشتہ ختم کر چکا تھا۔جب وہ اٹھا تو اس نے پوچھا: مسٹر بل: ناشتہ کا بل کتنا ہوا؟ بوڑھے انگریز نے مصنوعی غصہ سے کہا: میں مہمانوں سے پیسہ نہیں لیتا۔تم ابھی نئے آئے ہو Welcome to states۔اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ شاہنواز عابد نے ایک سردمہری کی زندگی ایک عجب معاشرہ میں گزری تھی۔اس کو اس کی صورتحال میں کیا کرتے ہیں بالکل بھی نہیں پتہ تھا۔وہ اُٹھا بوڑھے بل کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا اور نہایت احترام سے shop سے باہر نکل گیا۔اور وہاں سے سیدھا ہی سکول آف فلم چلا گیا۔بس میں اس کو چڑھتے ہوئے ہلکی سی موچ آ گئی وہ جلدی جلدی چڑھ رہا تھا کہ پاؤں پھسل گیا۔فوراً سے ایک امریکی عورت جو کہ پچاس کے پیٹے میں لگتی تھی۔اس نے Oh, Boy کہہ کر اس کو سہارا دیا۔ایک لڑکا جو کہ سامنے سیٹ پر بیٹھا تھا ایک لڑکی کے ساتھ وہ فوراً اُٹھ گئے اور اس کے جوگر اُتار کر اس کے پاؤں کو لڑنے نے ملنا لگا اور مسکرا کر کہا کہ مجھے بھی اکثر فٹ بال کھیلتے اس طرح کی موچ آتی ہے "میری" مجھے اس طرح ملتی ہے۔پاؤں تو ٹھیک ہو جاتی ہے۔ساتھ ہی اس نے اپنی بائیں آنکھ کو ہلکا سا دبایا۔ واقعی اس سب سے اس کو موچ میں آرام محسوس ہوا۔امریکی لڑکی "میری" نے بس ڈرائیور کو کہا کہ on the way ہی بس تھوڑی آگے روکی اور وہ دونوں امریکی لڑکا میک اور میری اس کو اس کے فلم سکول تک چھوڑنے آئے۔

بوسٹن فلم سکول میں دو ہفتہ میں کچھ نیا نہ تھا۔وہ کیمرہ اور فلم میکنگ کی basic باتیں جو کہ وہ پہلے سے جانتا تھا۔یہ دو ہفتہ اپنے گروپ کے ساتھ ملتے جلتے بوسٹن کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے اس کے گزر گئے گو کہ فلم میکنگ کے حوالے سے کچھ خاص نیا نہ تھا۔صرف یہ کہ امریکی کیمروں کے برینڈز کے بارے میں پتہ چلا۔لیکن زندگی کے یہ دو ہفتہ بہت دلچسپ تھے۔فلم سکول میں Music پروگرام ہر تین روز بعد ہوتا تھا۔جس میں گروپ کے لوگ ہلہ گلہ کرتے تھے۔مقامی

آرٹسٹ ٹائپ لوگ کو ان شو میں بلایا جاتا تھا۔ دونوں ہفتہ اتوار شاہنواز نے دو مختلف پروفیسرز کے گھروں میں گزارے۔ وہ ان کے ساتھ ان کے فیملی ڈنر میں شامل ہوتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے تھے۔ مثلاً زندگی کیا ہے؟ اور پاکستان اور امریکہ میں اس کے طرز میں کتنا فرق ہے؟ اور کیوں ہے؟ معاشرہ کا ڈھانچہ اور لائف اسٹائل کے بارے میں طویل باتیں امریکی سیاسی جماعتیں اور دو جماعتی سسٹم اور امریکہ میں ریاستوں کے مختلف مذہبی کے حوالے سے رویہ۔ بالکل ویسے ہی اس کے ذہن میں ان کے بارے میں رائے سوشل سائنسز کے جنرل باتیں۔ یہ موضوعات ہوتے تھے گفتگو کے ان کے ہفتہ کے اختتامی دنوں کے کھانے کے دوران اور ان کے ساتھ weekend گزرتے ہوئے دونوں weekend اس نے باسکٹ بال کا میچ اپنے پروفیسرز کے بیٹے کے ساتھ کھیلے۔ شاہنواز کو یہ تو پتہ تھا کہ پاکستان میں ایک طبقہ امریکہ کا عاشق تھا اور ایک طبقہ امریکہ سے نفرت کرتا ہے لیکن ان دونوں رویہ کی بنیادیں اگر ہیں؟ تو کدھر ہیں؟ اور یہ رویہ بے شک ایک رات میں نہیں بنتے۔ یہ لامحالا ایک طویل دورانیہ تک ہونے والی سیاسی وسماجی عمل کا نتیجہ ہیں۔ تو اس سوال کا جواب کہ وہ رویہ کب کیوں اور کیسے بنا؟ اور اب کیا صورتحال ہے؟

ان تمام سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے ایک محدود زندگی گزاری تھی۔ جس میں اس کا وقت ایک محدود دائرہ میں ہی گزر گیا تھا۔ اس کو بالکل بھی نہ پتہ چلا کہ دنیا میں یہ سب بھی ہو رہا ہے۔ اب اس سب میں اس کے علاوہ وہ کر سکتا تھا کہ اپنے آس پاس کے پروفیسرز اور طلبہ سے صرف سنتا ہے اور سر دھنتا اور یہ ہی کام وہ اب دھیان و گیان سے کر رہا تھا۔ اس طرح دو ہفتہ گزار کر وہ لاس اینجلس کی طرف روانہ ہوا۔ اب آگے مزید 3/4 ہفتہ کی تربیت وہاں ہوگی اور اس کے بعد ہفتہ عشرہ امریکہ کا ٹور کرنے کے لیے ہوگا۔ پھر واپسی مجموعی طور پر یہ 7/8 ہفتوں کا scholarship پروگرام تھا۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں ان کے گروپ کی

Alocation ہوئی۔وہ لوگ بذریعہ جہاز بوسٹن سے لاس اینجلس روانہ ہوگئے۔

لاس اینجلس، ہالی وڈ، دنیا جس کے بارے میں ہمیشہ متجس رہتی ہے اور شائد رنگین بھی ہے۔ یہاں ان کوفلم سازی کے بارے میں عملی تربیت دینی تھی اور اس کے علاوہ LA میں آوارگی کرنی تھی یہ دوکام اس نے آنے والے 25 دن تقریباً کرنے تھے۔ LA کی ائیرپورٹ پر پھروہی سب کچھ تھا جوکہ وہ لندن۔ بوسٹن کے ائیرپورٹ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ ائیرپورٹ سے یونیورسٹی کیمپس کی طرف جاتے ہوئے اس کومحسوس ہوا کہ وہ کسی بڑے شہر میں آیا ہے۔ وہی علامات جوکہ دنیا کے ہر بڑے شہر میں ہوتی ہیں۔ LA میں نکلتے ہی محسوس ہونے لگی۔ موسم میں عجب اپنائیت تھی کہ بالکل کراچی کی طرح کا لگا۔ نہ گرم نہ سرد اور شہر میں رونق تھی مین شاہراہ کے ساتھ ساتھ کے شاپنگ کے پلازہ اور گلیوں میں کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ زندگی ہر حصہ میں ہر طرف شہر لاس اینجلس میں رواں دواں تھی۔ وہ کیمپس پہنچے تو ان کوحسب روایت ہاسٹل میں کمرے الاٹ ہوگئے اور ابھی صبح کا وقت ہی تھا۔ اس لئے اس نے کیمپس کا چکر لگانے کا فیصلہ کیا کیمپس کی عمارتیں شاندار تھی اور درخت ویسے ہی لمبے اور شاندار جیسے کہ اس طرح کے تعلیمی اداروں میں ہوتے ہیں۔ فلم سکول کی عمارت برطانوی طرز تعمیر کی تھی۔ وہ گھومتا گھماتا کینٹے میں آیا تو اس میں انڈین کھانوں کا بھی Menu میں ذکر تھا۔ اس نے دال اور سبزی مکس منگوائی اور اس کے ساتھ ٹھیک انصاف کیا اور پھر آرام سے کچھ دیر کینٹے میں بیٹھا رہا اور پھر دوبارہ اوپر آ کر سارے کو دیکھنے لگا اور پھر چپ کر کے ایک سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور اردگرد دیکھنے لگا۔ ایک عجب سی بات اس کومحسوس ہوئی۔ زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں اکیلے بیٹھے تھے کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ بہت کم گروپ کی شکل میں تھے۔ زیادہ تر اکیلے اکیلے بیٹھے تھے اور کچھ نہ کرنے میں مگن تھے۔ اس کولگا کہ شائد یہ سب بھی اس کی طرح نئے ہوں گے اس لئے شائد اکیلے اکیلے بیٹھے ہیں۔ لیکن بعد کے ایک ماہ میں اس کو پتہ چلا کہ یہ رواج ہے یہاں پر کہ لوگ کم کم ہی بولتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کوئی نہیں بولتا۔ بس ایک عجب سا معمول

ہے۔ اس میں مشغول ہیں۔ یونیورسٹی والوں نے سوسائٹی بنا رکھی ہے۔ جو کہ طلبہ و طالبات کو بُلا کر topic دیتی ہے کہ وہ بات کریں۔ لیکن زیادہ تر اس میں بھی چپ رہتے ہیں۔ آرگنائزیشن بُلا بُلا کر کہتا کہ کوئی رائے دو اس پر زیادہ تر facebook پر اپنے محدود social circle میں بات کرتے تھے بس اس میں بھی Add زیادہ ہوتے ہیں۔ رابطہ proper بہت کم کم ہی کسی سے ہوتا ہے۔ عجب سماجی رویہ تھا اس کیمپس میں اور شہر میں بھی۔ لیکن یہ بات اس کو 25 دن کے آخر میں پتہ چلی۔ وہ کیا کہتے ہیں آخری تجزیہ میں۔ وہ weekend پر اپنا اچھا خاصہ وقت لائبریری میں گزارتا تھا۔ وہاں پر آئے ہوئے لوکل ورشن اخبارات دیکھا تھا۔ ان میں بھی ایسے اشتہارات ہوتے تھے کہ کسی کو باتیں کرنے کے لیے آدمی چاہیے اور اس کا معاوضہ ملے گا۔ فی گھنٹہ پر دوست چاہیے جو کہ آئے اور کمپنی دیں۔ یہاں پر اس کی تربیت و تعلیم کا سارا سسٹم اور نصاب ایسا ہی تھا کہ ان کو مختلف سٹوڈیوز میں visit کرنا ہوتا تھا۔ ہالی وڈ میں ہر وقت فلم سازی کا عمل جاری رہتا تھا۔ بڑے اسٹوڈیوز تھے بڑے بڑے ہال کمروں میں stand والے کیمرے لگے تھے پھر روشنی کا سسٹم تھا جدید قسم کا background کے لیے علیحدہ پوری sience تھی۔ ایک چیز جو اس نے امریکہ میں ہر جگہ محسوس کی۔ وہ تھا ہر کسی کا اپنے کام کے ساتھ commited ہونا۔ بڑے بڑے اداکار بھی وقت کے پابند اور اپنے Dialogue زبانی یاد کر کے آتے تھے۔ اور اس کے بعد اداکارہ کو fitness صرف اس لیے ہی ضروری نہیں تھی کہ انہوں نے smart نظر آنا ہوتا ہے بلکہ itself فلم سازی کا عمل میں ایک مکمل جسمانی مشقت کا کام تھا۔ خاص طور پر جب گانے فلمائے جاتے تھے۔ وہ سارا دن یہی سب دیکھتا تھا۔ ان کو 3،3 دفعہ کسی بھی کیمرہ عملی طور پر کیمرہ سے کام کا تجربہ بھی دیا گیا۔ اس کو ویسے 4 دفعہ موقع ملا۔ جس میں وہ کیمرے سے لے کر باقاعدہ فلمانے کے عمل میں شامل ہوا۔ اس کو یہ کام اچھا لگا لیکن مختلف pose سے فلم سازی کرنا بھی ایک اچھا بھلا مشقت والا کام تھا۔ اور Angle کو سیدھا رکھنا بھی۔ یہ سارا عمل سیکھنے کے لیے

کم از کم 2/3 سالوں کا عملی تجربہ نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ایسی ہی فلم بنتی ہے جیسی پاکستان میں بن رہی ہے ۔ یہاں ہر وقت کی پابندی کا رواج اتنا تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ مقررہ وقت پر پوری cast، کیمرہ چیز اور تمام عملہ اور سامان مجال ہے کہ کوئی ذرا سا بھی آگے پیچھے یا لیٹ ہو۔ اور بہت کم مدت میں فلم تیار ہو جاتی تھی۔ مختلف studios تھےاور مکمل تھے ہر ہر لحاظ سے۔ ایکٹروں میں بھلے۔ ہر منظر کا مکمل انتظام پہلے سے ہی مل جاتا تھا۔

دن کا وقت اس کے لیے اچھا ہوتا تھا۔ وہ سارا دن شوق سے مختلف چیزوں کو دیکھتا اور سیکھتا اور اس کے بعد سر شام اپنے کمرہ میں واپس آ جاتا۔ وہ کراچی میں بھی تنہائی پسند تھا لیکن اس کامل و جامع تنہائی سے وہ بیزار ہو گیا تھا۔ رات کو ہی اپنی Assignment لکھتا تھا۔ جو کہ ہر ہفتہ میں دو ملتی تھیں۔ پھر اس کے بعد اکثر اپنا کھانا خود پکانے کی کوشش کرتا جو کہ عموماً کامیاب رہتا اس کے بعد تھکن اور بیزاری کی وجہ سے وہ لیٹ جاتا کبھی جلدی کبھی دیر سے نیند آتی غرض قصہ یہ کہ وہ اس سب سے باحیثیت مجموعی تنگ آ گیا اور لاس اینجلس کے 24 ویں دن جب ان کا کورس مکمل ہوا تو وہ وہاں سے چھٹیاں اور سیر کی بجائے سیدھا کراچی کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی فلائیٹ سے دو دن میں وہ کراچی پہنچا۔

(یہ کہانی 2015 کے آخر میں لکھی گئی)

☆☆☆☆☆☆☆

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👉
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

قصہ حسرت

میں نے چالیس سال پہلے فتح گنج چھوڑا تو گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ واپس نہ آ سکوں گا۔ فتح گنج لکھنو سے 20 پتھر باہر ایک دیہی قصبہ ہے اور یہی وہ جگہ تھی جہاں میں پیدا ہوا۔ میرا آبائی گھر اس وقت بھی نہایت خستہ تھا اور فتح گنج کی گوالمنڈی میں تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ مجھے رام پرشاد نے بتایا کہ الحاج شیخ مسافر خانہ کے تمام کمرے کانگریسی ممبروں سے بھرے پڑے ہیں اور ابو الکلام آزاد اندھے والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ کر باغ میں ایک جلسہ سے خطاب کریں گے۔ میں نہا دھو کر 12 بجے ہی مسجد پہنچ گیا۔ مولانا نے چند منٹ اسلامی فقہ پر بات کی پھر جمعہ کی جماعت کروا کے دفتر میں خاصہ تناول فرمانے چلے گئے۔ دوپہر 4 بجے جانانہ باغ عوام الناس سے بھر چکا تھا۔ لوگ مولانا کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ جلسہ کی کاروائی کے بعد جب مَیں جا رہا تھا تو میرے ساتھ رام پرشاد تھا۔ میں نے رام پرشاد کو بتایا کہ میں وہ آزاد ہو گیا ہوں۔ میں نے زندگی میں دو دفعہ مولانا کو براہ راست دیکھا اور دونوں دفعہ مصافحہ کی جرات نہ کر سکا تھا۔

لیکن تیسری بار جب وہ وزیرِ تعلیم بن چکے تھے اور روزانہ دہلی کناٹ پیلس کے قریب ایک گراونڈ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ میں کئی دن سے مولانا کی تاک میں تھا۔ سارا سارا دن پُرانی دہلی اور مہرولی کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتا اور رات کے وقت کسی کھنڈر میں سو رہتا ،اُس دن ہمت کر کے اور بھاگ کے مَیں نے مولانا کو سامنے سے جا لیا تھا جب وہ قاضی کے حوض کی طرف پیدل ہی جا رہے تھے، اگر چہ دو گارڈ بھی ساتھ تھے لیکن کسی نے مجھ سے پُرسش نہیں کی اور میں مولانا کے برابر ہو کر ساتھ چلنے لگا۔ مولانا نے مجھے ایک نظر تعجب سے دیکھا، پھر آنکھ کے

اشارے ہی سے بولنے کو کہا لیکن کوشش کے باوجود وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا بس چلتا رہا۔ اتنے میں مولانا کی موٹر سامنے آ کر رُک گئی اور وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُس میں داخل ہو گئے مگر نہ جانے کیونکر جاتے ہوئے وزٹنگ کارڈ میرے ہاتھ میں تھما گئے، اُس دن کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جس میں میرے دیکھنے کے لیے ایک ایسی دنیا سامنے تھی کہ اُس کا اندازہ پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ مجھے مولانا آزاد نے اپنے دفتر میں ہی دوسرے درجے کے کلرک میں رکھ لیا تھا۔ وزارت کے تمام اختیارات مولانا ہی کے پاس تھے۔ لیکن عملی طور پر نہ صرف مولانا ہی بلکہ گورنمنٹ کے سبھی اختیارات سردار پٹیل ہی کے پاس تھے۔ جس کا احساس مولانا کو تو شاید پہلے ہی ہو چکا تھا مگر مجھے اُسی دن ہوا۔ میرا ڈیسک ریسپشن کے ساتھ ہی تھا جہاں سے عمارت کی مین انٹرنس شروع ہوتی تھی ،صبح دس بجے تھے میں ایک منشی کے ساتھ بیٹھا معمول کی ٹائپنگ میں میں مصروف تھا کہ ایک دم دفتر میں جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ سپاہی اور دو چار پیادے ہشیار باش کی شکل مُن آگے دوڑے آئے اور کہا ،دیکھو بھائی سردار صاحب اا رہے ہیں، مولانا کو خبر کر دو۔ میں نے اٹھ کر پی اے کے کمرے میں جھانکا اور یہی جملہ دہرا دیا۔ پی اے نے جیسے ناک سکیڑ لی ہو۔ خیر میں یہ کہہ کر واپس ہوا ہی تھا کہ سردار پٹیل کمرے میں داخل بھی ہو گئے۔ اتنے میں مولانا اپنی کرسی سے اُٹھ چکے تھے۔ مگر سردار پٹیل نے مولانا سے سلام لے کر فوراً کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ مولانا ابھی کھڑے ہی تھے۔ میرے لیے یہ لمحہ بالکل اچانک اور نیا تھا۔ مولانا کے چہرے کی ناگواری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ طوعاً خود بھی بیٹھ گئے اور کہا، جی کوئی خدمت، سردار پٹیل نے فوراً کہا مولانا خدمت تو ہم آپ کی کرنا چاہتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کریں۔ خیر مطلب پہ آتے ہیں، آپ کی عینک کے شیشے میرا خیال ہے اب دھندلا چکے ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں آپ ہمارے ساتھ ہیں تو ہماری عینک استعمال کر لیا کریں ،مولانا نے گھبرا کر کہا، سردار صاحب، عینک تو میری بالکل صاف ہے مگر آپ کو شاید احساس نہیں ،تعصبات کے دائرے اِس بے ضرر تعلیم کے محکمے میں کیوں پھیلانا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں مولانا،

آپ کو انکار کرنا میرے بس میں نہیں تھا، سمجھا درخواست کرلوں کہ فی الحال آپ کے محکمے میں اتنے فنڈ دینے کی گنجائش اس لیے نہیں کہ ابھی کشمیر اور حیدرآباد کی لشکر کشی روکنا ہے جو آپ کے بھائی بندوں نے کراچی سے کر رکھی ہے۔ مولانا آزاد کو سردار پٹیل کا یہ جملہ سنکر ایک دھچکا سا لگا اور وہ پٹیل کا منہ دیکھنے لگے۔ دراصل مہاتما کی قتل کے بعد حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی کو احساس تک نہ ہو سکا اور یہ حالات نہیں بدل رہے تھے لوگوں کی فطرت بدل رہی تھی۔ ایسی جرات اور دیدہ دلیری واقعی مہاتما بھی نہیں کرسکتا تھا مگر مولانا کو یہ احساس اُسی وقت ہو گیا تھا جب ایک دفعہ کابینہ کی میٹنگ میں ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ نہرو پٹیل کے سامنے جوابدہ ہے اور آج یہی بے بسی مولانا کے لیے مقدر محسوس ہو رہی تھی مگر مولانا شاید اِس وقت مسلم لیگ سے اتنے فاصلے پر تھے، جتنے فاصلے پر دلی کراچی سے۔ میں وہاں کچھ دیر کھڑا پٹیل کی بات سُنتا رہا جس میں سردار مولانا کو آخری حد تک احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ دراصل ایک مسلمان پہلے ہے اور کانگریسی بعد میں۔ یہ وہ پہلی ڈور تھی جو مولانا کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی تھی۔ پھر دو چار سال میں ہی میرے دیکھتے دیکھتے مولانا تائی جی کے ہم پایہ ہو گئے تھے اور اب پتا نہیں۔ یہ تائی جی کون ہے؟

میں نے موڑ پر کھڑے ہوئے تانگوں اور رکشا کھینچنے والے لوگوں پر نظر ڈالی۔ مریل رکشہ کھینچنے والے بنگالی پہلے صرف کلکتہ، مرشد آباد، چٹا گانگ اور ڈھاکہ میں تھے۔ اب خیر سے لکھنو کے مضافاتی شہروں تک بھی پھیل چکے تھے۔ چالیس برس قبل مجھے اکثر تانگے والے پہچانتے تھے لیکن اب کوئی میرا اشنا سا نہ تھا۔ قصبہ کی طرف جانے والے راستہ پر گزشتہ سے کچھ کم ویرانی تھی ۔نواب صاحب بلم پور کا باغ ، جسے میں ہرا بھرا چھوڑ کر گیا تھا، اب اُجڑ چکا تھا۔ نواب کی حویلی تو سنبھال سرکار میں تھی لیکن ان کا یہ وسیع باغ فتح گنج میں تھا۔ اس لئے نواب صاحب کو باغ کی دیکھ بھال اور دیگر امور میں کوئی پریشانی نہ تھی مگر نواب صاحب کو اس وقت کی نو قیام شدہ حکومت میں

وزارت کی پیشکش ہوئی تو وہ چلے گئے اور پیچھے سے باغ زرعی اصلاحات میں ضبط ہو گیا اور کچھ بنگالی پناہ گیروں کو الاٹ کر دیا گیا، جن کو نہ تو آم کھانے کا ذوق تھا اور آم اُگانے کا۔ اس باغ میں اب بنگالیوں کی جھونپڑیاں تھیں، ساتھ ہی کچھ چوہڑوں نے بھی جھونپڑیاں بنالی تھیں۔ یہ مقامی بے زمین چوہڑے مسلی تھے، جن کو صرف فصل کی فصل یا گھروں کے تعمیرات کی سخت مزدوری کا کام ملتا تھا۔ فتح گنج کی تین چوتھائی آبادی تقسیم سے پہلے بھی مسلمان تھی اور اب اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہی تھی۔ اس قصبہ میں مولانا آزاد اور مولانا مدنی کی عقیدت مندی اور نیازمندی بہت تھی۔ اس لئے زیادہ لوگوں نے ہجرت نہیں کی۔ میں بھی تقسیم کے دنوں میں محض اتفاق سے مغربی پاکستان چلا گیا تھا، پھر اُدھر ہی پھنستا چلا گیا۔

فتح گنج کا قدیم محرابی باب لکھنو جسے روہیلہ گردی کے بعد اس وقت کے نواب آف بلم پور ہی نے تعمیر کروایا تھا۔ ابھی تک بمعہ تختی کے موجود تھا لیکن نہایت خستہ حال ہو چکا تھا۔ میں شہر میں داخل ہوا تو قصبہ میں کوئی بھی ایسا گھر نہ تھا جسے اپنا گھر کہہ سکوں لیکن میرے کچھ رشتہ دار یقینی طور پر اسی حویلی میں موجود تھے، جو میرے پردادا کی ملکیت تھی، جس میں آنکھ کھولی تھی۔ حویلی میرے ہوش سنبھالنے کے وقت سے ہی دادا کے بھائیوں اور اس کے باپ کے بھائیوں میں تقسیم تھی اور خاصی گنجان آباد تھی۔ اُس کے مختلف کمرے ہی گھر تھے اور درمیان میں راستہ تھا۔ اسی طرح یہ حویلی ایک طرح کی گلی بھی تھی اور محلّہ بھی لیکن اس گلی یا محلّہ کو ہی مَیں گھر کہتا تھا۔

میں حویلی کے سامنے پہنچا تو مرکزی دروازہ کھلا تھا لیکن اس کا رنگ گرد و غبار کی تہہ در تہہ چڑھنے کی وجہ سے سیاہ مائل ہو چکا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں۔ اس کے طاق میں پتہ نہیں کب کا بجھا ہوا چراغ پڑا تھا اور اترتے چڑھتے ہوؤں کے ہاتھوں سے درو دیوار بھی دب سے گئے تھے۔

میرے اوائل سالوں میں، جب زمیندار دادا زندہ تھا تو جمعہ کے دن حویلی کے باہر فقراء

اسی دروازے اور سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر صدا لگاتے تھے اور دادا کے بلانے پر صرف ایک فقیر ہی اوپر جاتا تھا۔ یہ تماشہ ہر جمعہ نماز کے بعد عصر تک چلتا اور جتنے فقراء ہوتے، تو تماشا دیکھنے کے لیے فقراء سے زیادہ قصبہ کے بانکے جمع ہوتے تھے۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوا کہ دادا کو ساری زندگی سماجی رتبہ کی تلاش رہی، جو اُن کو نہ مل سکا۔ وہ معمولی سے کاشتکار ہی رہے۔ یہ واحد طریقہ تھا اُن کے کچلے ہوئے نفس اور انا کی تسکین کا۔

دادا جی کے علاوہ حویلی کی دوسری معروف ہستی تائی اماں تھی۔ وہ سب سے بڑے بیٹے کی بیگم تھی، جو گھر کے واحد کمانے والے بھی تھے۔ حویلی کے گھریلو منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ بڑی تائی کو سب بہو بیگم یا بہو بی بی ہی کہتے۔ اسی پس منظر میں مَیں نے اپنا بچپن اور نوجوانی گزاری۔ اس سیڑھی کے ہر قدم پر یادوں کی بارات تھی۔ در و دیوار کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی نے بھی عشروں سے ان کی مرمت کی طرف توجہ نہیں کی۔ مَیں نے جب آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور اوپر والی منزل کے برآمدہ میں جھانکا تو سہ پہر کی دھوپ کا وقت تھا۔ جیسے ہر جاتی ہوئی شے میں ایک اداسی ہوتی ہے۔

تائی بیگم حسب سابق عشروں بعد بھی اِسی پیڑھی پر بیٹھی دال صاف کر رہی تھی، جس پر گزرے وقت میں بیٹھا کرتی اور پورے کنبے پر حکم چلاتی تھی لیکن اب عمر گزر گئی اور وہ بہت بوڑھی نظر آ رہی تھی۔ دال صاف کرنے کا مصرف وقت گزارنے کا بہانہ تھا۔ وہ نہایت توجہ سے دال میں سے کنکر ڈھونڈ رہی تھی اور ان کی شاہی میں بھی صرف وہی عمر رسیدہ افراد خانہ اور بچے بچ گئے تھے۔ جن کو مدراس اور حیدر آباد اور ممبئی میں کسی بھی شعبہ میں کوئی کھپت نہ ہوئی تھی۔ عجب سکوت تھا۔ پتہ نہیں کتنے ہی لمحے یوں گزر گئے۔

میرے سینے میں اس منظر کا سکوت اور اداسی اُتر رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے آگے جھک کر ایک جھٹکا سا لیا اور سیدھا تائی بیگم کے پاس گیا: تائی جی سلام۔

تائی بی بی اجنبیت سے بولی ''ہائے'' یہ تو ذاکر کی آواز معلوم پڑے ہے پھر پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے ہی چشمہ درست کیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ''ہائے یہ تو ذاکر ہی ہے''۔

پیڑھی پر سے آواز دی 'اے کمالے اے کمالے'' میں صدقے، دیکھ تو سہی، ہمارے ازلوں کا گم ہوا بچہ حویلی واپس آ گیا۔ ہائے کیسے کیسے معجزے ہوتے ہیں۔ اس دوران اندر سے 50 برس کے پیٹے کا کمال حسین نکلا اور اس نے مجھے دیکھ کر چپ چاپ ہی گلے سے لگا لیا۔ اُسی لمحے دونوں کی آنکھیں تر ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

سودا

چودھری کا ڈیرہ خالی پڑا تھا۔ چودھری دلدار دھوپ میں سویا پڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر ندیم کو بہت غصہ آیا کہ میرے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور یہ آرام سے دن چڑھے تک سویا پڑا ہے۔

اب حادثہ کیا ہوا یہ بھی سنیں۔

ندیم مصلی جو کہ ضلع جھنگ کے گاؤں صوبے دی جھوک کا رہائشی تھا نے بھی اپنی برادری کے قانون کے مطابق جب جوان ہوا تو اپنی شادی کے لیے رقم اکٹھی کرنی شروع کی۔

کافی سوچ کر اس نے بکریاں رکھیں۔ پانچ سال کی جدوجہد کے بعد 50 ہزار جمع کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ فوری طور پر ''سلطانی مصلن'' کا رشتہ پکا کرے۔ اس نے خاص طور پر اپنی ماں کو کہا کہ اس کی بہن ''جُونی مصلن'' سے ہر صورت گریز کرنا ہے۔ کیونکہ وہ اس کو زہر لگتی ہے۔ بعد از طویل صلاح و مشورہ کے اس کی ماں عامری مصلی کے گھر گئی اور ان سے رشتہ مانگا۔

عامری مصلی کرتا کراتا کچھ نہ تھا۔ بس ٹھگی پھبی پر ہی گزارا کرتا تھا۔ عرض طویل بحث وغیرہ کے بعد بالآخر عامری 45 ہزار میں رشتہ کے لیے راضی ہوا۔

دو دن بعد بغیر کسی دھوم دھام کے شادی ہو گئی۔ بلکہ رخصتی ہو گئی۔ عرض شادی کیا ہوئی۔ ادائیگی ہوئی اور پردہ میں سامان آ گیا۔ 45 ہزار عامری مصلی کو دیا۔ باقی 4 ہزار کی روٹی پکی اور ایک ہزار کا گھی لیا گیا۔ کیونکہ خالص شے ہے اور بے حد فائدہ مند ہے۔ عرض صاحب پردہ میں ہی منکوحہ جھگی میں پہنچی۔

اس شام جاتے جاتے اس کے سسر عامری مصلی نے کہا'' آج رات کا تو پھر تو خوب کبڈی کھیلو گے۔''

خیر پہلے تو اس نے سوچا کہ عامری تو گیا۔ اب کچھ گفتگو کرا لو لیکن پھر اس کو یاد آیا کہ پہلے کبڈی میں زور دکھا دو تو زیادہ دھاک بیٹھ جائے گی۔ ورنہ یہ عورتیں بھی نا سر چڑھ جاتی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ جھگی میں گیا اور عرض ساری رات کبڈی کھیلی اور خوب کھیلی۔ کمال کی بات یہ ہوئی کہ اس رات اس کی منکوحہ وزوجہ ایک لفظ نہ بولی۔

اس نے سوچا کہ شاید گھر سے آئی ہے تو اس لیے اداس ہے اور زیادہ بات نہ کر رہی ہے۔ خیر جیسے تیسے سورج مشرق سے نکلا۔ اور جھگی میں رات بھر کی کبڈی ختم ہوئی اس نے سوچا کہ اب وہ خالص گھی کا ناشتہ کرے گا اس نے اپنی بھائی کے ذمہ لگایا تھا کہ صبح آٹھ بجے آ کر خالص گھی کا ناشتہ پراٹھے پکائے بلکہ لائے۔

خیر صبح صبح ایک نئی امنگ کے ساتھ اُٹھا اور باہر کھیتوں میں حسبِ معمول سیر کے لیے نکل گیا۔

کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپسی ہوئی۔ دورانِ سیر ایک منزل کو پا لینے کی خوشی کی کیفیت میں رہا۔ کبڈی تو پھر کبڈی تھی اس کا اپنا ہی سرور تھا۔ وہ تو کرنے کا کام اب لفظوں میں کیا بیان ہو بلکہ عیاں ہو۔

خیر کیا پُر کیف صبح تھی۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ سلطانی مصلن کی جگہ جونی مصلن آئی بیٹھی ہے۔ اس نے دور سے دیکھا اور سمجھا کہ شاید اپنی بہن کو ملنے آئی ہے لیکن گھر میں داخل ہوتے اس نے دیکھا کہ اس کی ماں بھی افسردہ بیٹھی ہے۔ گھر کی فضا میں افسردگی بلکہ کشیدگی واضح محسوس ہوتی تھی۔

اس نے سوالیہ نظروں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا کہ ''سلطانی'' کہاں ہے اور یہ ''عامری'' کیوں اکیلی بیٹھی ہے۔

اس کی ماں نے کہا کہ ''اوئے تو نے ہمیں بتائے بغیر ہی گوی بدل لی۔ اس نے پوچھا ''کون سی گوی؟''

اس کی ماں نے کہا کہ ''تیری جھگی میں سے یہ نکلی ہے۔ اس کے ساتھ ساری رات سہاگ رات منائی

ہے اور اب پوچھتا ہے کونسی گوی؟ اس کو فوراً سمجھ آ گئی کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ اس کو پردہ میں سامان بدل کر دے دیا گیا ہے۔ یہ سب ہوا کیا یہ دیکھ اور سمجھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس کو اور تو کچھ سمجھ نہ آئی اس نے ڈنڈا اُٹھا اور اس "عامری" کو آگے لگا کر کہا "چل! اپنے باپ کے گھر"

اسی دوران اس کا بھائی جس کو اس نے ناشتہ پکانے کے لیے بلایا تھا وہ آ گیا۔ اس نے ساری صورتحال دیکھی اور سمجھائی تو پوچھا:

ندیم: اب اس ناشتہ کا بلکہ گھی کا کیا کروں۔ باقی 49 ہزار تو سمجھ ضائع ہو گئے۔ ندیم نے کہا "اوئے کنجرا! ایں گھی تو کتی کو پلا لے" ناشتہ اب یہ اپنے گھر ہی کرے گی۔

اس کے بعد وہ اپنے سسرال پہنچا تو اس کے سسرالی نے کمال اداکاری کرتے ہوئے ان دونوں کو وصول کیا۔

تمام مدعا کمال اطمینان سے سنا اور بولے: دیکھو ندیمو! گل ایہہ ہے کہ تیری ہماری بات عامری کی ہوئی تھی۔ سلطانی کی نہیں۔ دوسرا تو خود کل اندھا تھا۔ چلو وہ تو سو ہوئی سو ہوئی۔ کمال کی بات ہے کہ تو ساری رات وہ کیا بولے ہاں کبڈی بھی کھیلتا رہا۔ اب یہ تو تم یہ کہو کہ تم اندھے تھے کہ سارا دن اور ساری رات تم کو نظر کچھ نہ آیا۔ اور ساری رات چس لی اب آ گئے ہو۔ دوسری دو؟؟

میاں داماد! ٹھیک ہے تم ہمارے داماد ہو۔ لیکن اب یہ تو نہیں نا کہ ہم سارا کچھ ہی صرف 45 ہزار میں تم کو دے دیئے۔ نہ جی نہ۔ یہ تو نہ ہوگا۔

نہ ہم نے فوراً ان کی دھمکی دی کہ میں یہ مسئلہ گاؤں کی پنچایت میں چودھری دلدار کے پاس لے جاؤنگا۔ چودھری کا نام سن کر اس کا سسر تھوڑا سا دبا۔ اس نے فوراً بات بدلی اور لہجہ مزید ٹھنڈا کر کے کہا "چلو! باقی تو ساری بات ٹھیک! لیکن یہ جو تو وہ کیا بولے ہاں کبڈی کھیلتے رہے اس کا کیا ازالہ ہے۔"

خیر دونوں ایک دوسرے سے خوب بحث کی۔ کوئی بات طے نہ ہوئی۔ وہاں سے ندیم سیدھا چودھری

کے ڈیرہ کی طرف روانہ ہوا تو راستہ میں ملک حشمت آتا دیکھائی دیا۔اس کے کندھے پر بندوق تھی۔ندیم کو دیکھ کراس نے دور سے کہا کہ اوئے ندیم! کتھے جاریا ایں۔اس کی بندوق دیکھ کر ایک دفعہ تو اس کا دل کیا کہ ملک حشمت سے بندوق لے کر اپنے موجودہ بلکہ سابقہ نہ نہ بلکہ متنازعہ سسر کو گولی مار دے۔

ملک حشمت نے کہا کہ مین تے سور دے شکار تے جاریا توں وی چل!اس نے اپنا دکھ ملک کو سنایا اوراس سے بندوق مانگی۔

ملک حشمت نے دوبارہ چلتے چلتے کہا ''اوئے ندیمو!اگر تیرے اس سسر کو بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تو بندوق سے بھی نہیں پڑے گا کیونکہ یہ بندوق تو میں نے سور مارنے کے لیے رکھی۔بندہ اگر ہو بندہ تو اس کو تو گل (بات) ہی مار دیتی ہے۔ندیم نے سوچا ''بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ اس کے سسر پارٹی کو کون سمجھائے۔چودھری دلدار کے ڈیرہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چودھری سویا پڑا ہے۔اس کے بیٹھنے کی کھڑک سے چودھری جاگا۔اس نے احتراماً چودھری دلدار کی چادر ہٹائی۔چودھری نے ٹیک لگا کر بیٹھا اور توجہ سے ندیم کی مکمل بات سنی۔ساری بات سن کراس نے واحد سوال پوچھا کہ کل تیرے پاس 50 ہزار ہی تھے؟ندیم نے کہا:جی!اس نے کہا:ندیم اور بکرے نہیں ہیں؟ ندیم نے کہا:نہیں!بس وہی تھے۔

دلدار بولا:ندیمو! کھڑا ہو۔وہ کھڑا ہوا،چادر اُٹھاؤ۔اس نے چادر اُٹھائی۔اس نے کہا یہ میرے اوپر ڈال دے۔اس نے ڈال دی۔وہ ابھی احتراماً کھڑا ہی تھا کہ چودھری دلدار کے پھر خراٹے بھرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

وقار سپرا کا تعلق پنجاب کے راوی اور چناب کی درمیانی بار سے ہے۔ وہ افسانہ، کالم، ناول، تاریخ اور علمی ریسرچ کے حوالے سے کام کرتے ہیں۔ وہ یہ کام 4 مختلف زبانوں میں جو کہ انگریزی، اردو و دیگر میں کرتے ہیں۔

گزشتہ سالوں میں ان کے 30 سے زائد تحقیقی مقالہ جات مختلف قومی اور بین الاقوامی کانفرنس میں منظور ہو چکے ہیں۔ جو کہ انتھروپولوجی، صوفی ازم، جنوبی ایشیائی تاریخ و معاشرہ، لاہور (شہر۔ زندگی۔ ارتقاء) ورثہ کلچر اینڈ آرٹ، فلم، ڈرامہ اور سینما، ماحولیات (پانی۔ ہوا کا معیار۔ درخت وغیرہ) پر تھے۔

وہ گزشتہ 15 سالوں سے سیاسی و سماجی تحریکوں کا بھی حصہ رہے۔ ان کو طویل سیاسی و سماجی و ادبی کام پر مختلف ایوارڈز بدست گورنر پنجاب سمیت مختلف تنظیموں کی طرف سے جاری کئے گئے۔ ان کے کالم مختلف اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی، اخبارات میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ مترجم کے طور پر انگریزی سے پنجابی پر کام کر چکے ہیں اور ابھی مولانا روم کی کہانیوں کے ترجمہ کا کام بھی جاری ہے۔

نسبت پبلیکیشنز

217-218 میمونہ سنٹر تھرڈ فلور سید موج دریا لاہور۔

0304-0042254, 0300-6993429, 0324-4716026